مُشک بام

سمیرا حمید

kitaabghar.com

الحمد للہ

"مشک بام"

اس ماہ سے آپ مشک بام پڑھنے جا رہے ہیں۔میں نے ضروری سمجھا کہ کچھ پوائنٹس پر بات کر لی جائے تاکہ آپ کے لیے آسانی رہے۔ جب آپ یہ کہانی پڑھیں تو لاہور کو آج کا لاہور نہ سمجھیں۔ یہ اس لاہور کی کہانی ہے، جس لاہور کے گرد چار دیواری، (فصیل) تھی، اور جس کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ فصیل کے باہر باغ تھا، نہر تھی۔ایک خوش کن سکون تھا۔ وقت میں برکت تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ گھوڑے اور ہاتھی تھے۔ ڈولیاں،تانگے اورگھڑ گاڑیاں تھیں۔ جنہوں نے کبھی لاہور نہیں دیکھا وہ یہ جان لیں کہ شہر، شاہی مسجد، اور قلعہ ساتھ ساتھ ہیں۔شہر میں رہنے والے بہت آرام سے شاہی مسجد اور قلعے تک چل کر چلے جاتے تھے۔

شہر میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے رہتے تھے۔مذہبی رواداری بہت تھی۔ ہر عبادت گاہ کا احترام تھا۔ لحاظ مروت اور اخلاق تھا۔یہ کسی بھی شہر کا بڑا پن ہوتا ہے کہ اس میں ہر مذہب کے لوگ آرام و سکون سے رہیں۔ انہیں کبھی یہ احساس نہ ہو کہ وہ شہر ان کا نہیں ہے۔لاہور سانجھ تھا۔سب کا تھا۔ اسی لیے یہاں سے ہجرت کر جانے والوں کا دل پھر کہیں اور نہیں لگا۔ جیسے اپنی ماں سے بچھڑ گئے ہوں۔کچھ شہر گھر بسانے کے لیے جگہ تو دے دیتے ہیں، لیکن دل کی زمین مخصوص رکھتے ہیں۔ لاہور نے گھر بسانے کی جگہ دی، اور دل میں بسا کر اپنا بھی لیا۔ پھر یہ شہر تو جان دے کر خریدا گیا ہے۔اسے بغداد کا سایہ کہا جاتا رہا۔یہ شہر صرف ان لوگوں کا نہیں جو یہاں پیدا ہوئے ہیں، یہ ان سب کا ہے جو اس کا دل بن گئے۔اسے اپنا دل بنا لیا۔مجھے اس شہر کی یہ ادا پسند ہے، یہ کھلے دل سے خوش آمدید کہتا ہے، جو تاریخ سے بھی ثابت ہے۔ اس کے حسن و جمال یا شہرت کا یہ عالم تھا کہ ملکہ نور جہاں نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر اسے پسند کیا۔ وہ جھروکے میں بیٹھ کر شہر کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ اسے یہ شہر بے انتہاء پسند تھا۔اسی پر اس نے اپنا مشہور شعر کہا جو آپ ناول میں پڑھیں گے۔

جس وقت کی یہ کہانی ہے اس وقت بولی جانے والی زبان و بیان آج سے بہت مختلف تھی۔ اگر میں کہانی اس زبان میں لکھتی تو آپ شاید ہی سمجھ پاتے۔ کیونکہ وہ انداز و بیاں تقریبا متروک ہو چکا ہے۔موجودہ وقت کے مطابق لکھنے سے کہانی کا رنگ زائل ہو جاتا۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ درمیان کا راستہ اپنا کر لکھوں۔میں نہیں چاہتی تھی کہ بریکٹ میں چیزوں کی وضاحت دوں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھے میں ایسے ہی خط لکھ کر آپ کو وضاحت دیتی رہوں۔کہانیاں لکھی جاتی ہیں، کہانیاں پڑھی جاتی ہیں،اور پڑھنے والے مختلف زمانوں میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ایک بار اس زمانے میں جا کر دیکھ آتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟مجھے یقین ہے کہ آپ "ہاں" کہتے ہیں۔

Sumaira Hameed
Jan 2022

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا ہے اور کامیابی دے آمین

"مشک بام"

محبت کی بارہ دری میں، بارہ دروازوں کی فصیل کھڑی ہے......

بارہ دروازے شہر کے......ایک دروازہ دل کا......

دل کا دروازہ کھل جانے کو ہے......

دل، بہار کا دل......جو شہر پر خراماں خراماں نثار ہے کہ خزاں کا وقت تمام ہوا جاتا ہے۔ بارہ دروازوں کا قلعہ بند شہر جان گنوا کے پایا ہے۔ اس کے حصول میں دل لٹایا، دل کے ٹکڑوں پر امان پایا ہے۔ راجہ لوہ کا لوہ پور......اروتی، پروشنی سنگ بہتا بغداد کا سایہ لاہور......قصوؤں کا دریا، داستانوں کا بہاؤ......

دربار لاہور میں بستی بستی بہار ہے......

بہار کی کلی......دُور......بہت دُور......شہزادہ کامران کی بارہ دری سے اپنی سواری میں سوار ہو چکی ہے۔ سواری کی پیشانی پر وکٹوریہ لکھا ہے۔ سوار کی پیشانی پر بہار کندہ ہے۔ کوچوان نے لگاموں کو پرزور جھٹکا دیا۔ گھوڑوں نے ہنگام برپا کیا۔ راوی کے کنارے کنارے سرپٹ دوڑنا شروع کیا۔ اس نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ پیشانی کے بال اڑے، آنکھوں میں ہوا کے جھونکوں نے دھوم دھام مچائی۔ وہ دلکش مسکرائی۔ دلنشین اترائی۔ بہار کا اپنا ہی بھیس ہوتا ہے۔ کبھی آنکھوں کے راستے آتی ہے کبھی دل کے۔

سب دروازے بند ہو جائیں تو دل کا دروازہ کھلا ملتا ہے......

"پلک جھپکتے میں مجھے شہر دکھائی دے جانا چاہیے۔" کوچوان کی طرف کی چھوٹی کھڑکی کھول کر کہا۔

شہر دور ہے......ابھی دور ہے......شہزادہ کامران کی بارہ دری گھوڑا گاڑی کی پشت پر دکھائی دے رہی ہے۔ سورج کی کرنیں دریا کے پانی میں سونا سونا بکھری ہیں۔ گھوڑا گاڑی دریا کے سنگ سنگ بھاگ رہی ہے۔ ہر شے پر سکوت بس اسی ایک گاڑی کا شور ہے۔ شہر کے آثار معدوم ہیں اور وہ چاہتی تھی کہ کوچوان جادو کر دے۔

"یہ گھوڑے ہیں یا گدھے......تیز کیوں نہیں دوڑتے......"

گدھے کوچوان نے گھوڑوں پر چابک لہرایا۔ان کی پیٹھ پر نہیں چھوڑا، ہوا میں آواز دے کر کھینچ لیا۔اب بس یہی کسر رہ گئی تھی کہ گھوڑے اُڑنے لگتے۔

''دن ڈھل گیا تو غضب ہوگا۔''

وہ اپنے نہیں، کوچوان کے حال پر آنے والے غضب کی بات کر رہی تھی۔دونوں گھوڑے تباہی مچاتے محرابی پل کی طرف بڑھے۔ پل کے کنارے بیٹھے دن کے پرندے اپنی جان بچا کر پھر اڑے۔کھڑکی سے وہ آدھی باہر نکل گئی۔پرندوں کے ہجوم کو اڑتے دیکھا۔غضب! پل اتنا تنگ تھا کہ کوچوان کی ہی مہارت تھی جو گاڑی گزار لے جاتا تھا۔کاش کبھی دو سواریاں ایک ساتھ گزریں۔ایک پل پار کر جائے، ایک دریا میں غرقاب ہو جائے۔

دریا میں غرقاب ہونے والے کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا آرہا ہے۔

یہ شہر کی سمت جا رہے ہیں، وہ ذیلی راستے سے راستہ کاٹنے آرہا ہے۔کوچوان کے کان کھڑے ہوئے۔ بہت دور شاہی مسجد کے مینار ظاہر ہوئے۔سورج ان کی پشت سے روشن تھا۔اس نے لگاموں کو جھٹک کر منہ سے زوردار آواز نکالی۔گھوڑوں کی رفتار جوشیلی ہوئی۔ دھول کے مرغولے بلند ہوئے، شاہی مسجد کے مینار نمایاں۔

''اور تیز.....'' وہ چلائی۔

اب کوچوان اور گھوڑوں کا مرنا باقی رہ گیا تھا۔گھوڑوں کی ٹاپوں نے شہر والوں کو یقیناً سہما دیا ہوگا۔کیا انہیں پھر سے شہر پر حملے کا گمان ہوا ہوگا۔اس شہر میں کتنا غدر مچتا ہے۔اس شہر میں اور کتنے حملہ آور آئیں گے۔ایک ہی تخت ہے لاہور کا، کون کون اپنا حق جتائے گا.....اب کون آیا.....

دُور..... بہت دور سے ''گھڑسوار''.....

شہر کا تخت سنبھالنے والے دُور سے ہی آئے.....

''تمہاری نالائقی نے تاخیر کروائی۔'' وہ پھر بولی۔

کوچوان کا دھیان اجنبی گھوڑے پر تھا، اسے تاخیر کی فکر تھی۔شہر کے افق سے قلعہ نکھر کر سامنے آنے لگا۔اور دائیں پہلو سے دھول کی دھند سے ایک اجنبی گھڑسوار بھی.....کوچوان نے غیر محسوس لمحے میں گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ان کی گھوڑا گاڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی، اور اس کا گھوڑا بھی۔اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ تو ہوش سے کام لے گا لیکن وہ اپنی دھن میں سرپٹ دوڑا رہا تھا.....دوڑا رہا تھا کہ.....کھڑکی سے دھول کا طوفان اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔وہ کچھ اور سوچتی کہ کمان سے نکلے تیر کی طرح گھڑسوار، سواری میں جتے گھوڑوں سے ٹکرا کر پار ہو گیا.....

اس نے آنکھیں میچ لیں.....

یکدم افتاد سے گھوڑے بدکے۔ گاڑی میں ہنگام برپا ہو۔ گاڑی گھوم کر، تہلکہ کر رہ گئی۔ وہ نشست سے بری طرح گری۔ کوچوان کو اسی کا ڈر تھا۔ اسے گھوڑے قابو میں کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ طیش سے سنبھلی، ڈگمگ بدکی گاڑی کا دروازہ کھول کر پائیدان پر نکل کر کھڑی ہوئی۔ اور پوری قوت سے چلائی۔

''دیوانے ہو کیا.....''

دیوانے، نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا.....

دھول کے بادل تھے..... دو گھوڑوں کی سواری اور پائیدان پر کھڑی ایک لڑکی تھی.....

اس کے بال اُڑ رہے تھے.....

ان بالوں میں حشر برپا تھا.....

☆.....☆.....☆

دیوانے کو اچانک افسوس ہوا۔ اسے ایسے اندھا دھند گھوڑا نہیں دوڑانا چاہیے تھا، کسی کا نقصان کر دیا۔ اس نے لگام کھینچ کر رفتار تھام لی۔ پیچھے سے گاڑی طوفان بنی آئی۔ کوچوان شعلہ جوالہ تھا۔ بھڑک کر للکار رہا تھا۔ گاڑی اس کے گھوڑے کو کچلتے ہوئے قریب سے گزری۔ وہ کوچوان کی للکار سمجھ چکا تھا۔ یہ ٹھیک ہے اس کی غلطی تھی، لیکن ایسے کوچوان کو اعلان جنگ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے کمتر، نالائق نہیں سمجھنا چاہیے تھا۔ لگام کھینچ کر اپنے گھوڑے کو بھی گھوڑوں کے پیچھے دوڑ میں اُتار دیا۔

گھوڑا گاڑی اور دیوانے کی دوڑ شروع ہو گئی۔

''میری عزت خطاء ہوئی تو تمہیں معاف نہیں کروں گی۔''

کوچوان کی طرف کی کھڑکی کھول کر پوری شدت سے چلائی۔ گردن گھما کر دوڑ لگانے والے کو دیکھا۔ دونوں قریب قریب ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ قلعے کے پہلو سے نکل کر، روشنائی دروازے سے اندر ہوئے..... برابر، ساتھ ساتھ..... چند لوگوں نے حیرت سے اس عجیب منظر کو دیکھا۔ دن چڑھے یہ کون سی فوج شہر کے اندر داخل ہو رہی ہے۔ گاڑی کو وہ پہچانتے تھے، لیکن گھڑ سوار اجنبی تھا۔ شہر میں جیسا تیسا اودھم مچا کر دونوں خضری دروازے سے باہر نکلے۔ ساتھ ساتھ، برابر۔ اب یہ کوچوان کی بھی ضد تھی۔ وہ اس پل کی سمت جا رہا تھا، جس طرف سے گزر کر آیا تھا۔

اسی پل کی طرف جسے ایک پار کرتا اور ایک غرقاب ہو جاتا.....

☆ ☆ ☆

حویلی کے صدر دروازے سے گھوڑا گاڑی اسی رفتار سے داخل ہوئی جس رفتار سے وہ شہر میں طوفان برپا کر چکی تھی۔ دروازہ کھلا، وہ پائیدان پر اتری، اور کود کر باہر نکلی۔ کوچوان کو شاباشی نظروں سے دیکھا اور صدر ڈیوڑھی سے بھاگتی ہوئی دالان میں آئی۔ کفایت کی آنکھ پھڑکی۔ وہ مچان پر چڑھی فانوس کی صفائی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے کود جاتی، وہ مچان کے قریب پہنچ کر اسے دونوں ہاتھوں سے ڈگمگا چکی تھی۔ کفایت نے چیخ ماری۔ لیکن چیخ بھی اسے گرنے سے روک نہیں سکی۔ ''یا اللہ ہم مجبورن کو اٹھالو اب۔'' گرنے والے نے اٹھنے سے پیشتر دہائی دی۔ گرانے والی کھلے احاطے میں بھاگ آئی۔ یہ احاطہ کھلے آسمان میں لگے دربار جیسا ہے۔ بڑی شان بان ہے اس کی۔ ساری حویلی یہاں سے بیٹھ کر نظارہ کی جاسکتی ہے۔ بالکل یہیں شام ٹھہر جانے کو ہے۔ چہل پہل شور غل ہے۔ اماں نے حویلی کی اینٹیں نہیں اکھڑوائی تھیں، باقی ہر طرح سے صاف ستھرائی جاری تھی۔ ان کی چہیتوں کی آمد آمد تھی۔ باغ کی طرف دھما دھم قالینوں کو پیٹا جا رہا تھا۔ بے چارے کئی دنوں سے اس حال سے تھے۔ قلعی گر برتنوں کے ڈھیر پر براجمان تھے۔ جیسے بارات کے استقبال کا اہتمام ہو۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، ہر طرف، ہر مہربان مصروف تھا۔ کام سمیٹنے والوں، کام کروانے والوں، کسی کو فرصت نہیں تھی۔ پیاری چچی، افروز چچی تخت پر بیٹھی سفید ململ سے اپنی جان، ''پان دان'' کو چمکا رہی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے آکر کھڑی ہوئی۔ گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔

''میری چراغ! ایسے ہانپ تانپ کہاں سے آرہی ہو!'' سر گھما کر اپنی چراغ کی طرف دیکھا۔

''جیت کر.....'' دھم چچی کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔ گال تمتما رہے تھے۔ آنکھوں میں چراغ روشن تھے۔

''اب کیا کر آئی ہو.....''

''چھوڑیں چچی! آپ نہیں سمجھیں گی۔''

جھک کر ناسمجھ چچی کے گال پر پیار کیا۔ دو چھالیہ اچک کر منہ میں پھانکیں۔ کمر کے بل گھوم کر ایک نظر آس پاس ہر طرف ڈالی۔ اس کا دل تھا کہ سب کو بتائے کہ آج کا دن کیسا شاندار رہا۔ لیکن اس کی باتیں سمجھتا ہی کون تھا۔ مجبوراً ایک اور ناسمجھ حور کو شرف نشست بخشا۔ دھم اس کے جھولے پر جا گری۔ اس کا قلم ڈگمگا گیا، سیاہی پھیل گئی، خط بگڑ گیا۔ اس کا منہ بنا۔ قلم کو سیاہی سے بھر کر اس کے گال پر رگڑ دیا۔

''تم سے ہار جانے والے کا منہ کالا!''

''مجھ سے ہار جانے والا بے چارہ.....'' سر گاؤ تکیے پر گرا کر قہقہہ لگایا۔ چہرے پر کھینچی سیاہ لکیریں خطِ دلبرم ہوئیں۔

دل.....دلبرم.....

کفایت گھٹنا مسلتی چچی کے قریب آئی۔ بسورا منہ مزید بسور لیا۔ مسلی ہوئی کلائی سے رستا ہوا خون دکھایا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' حور بانو نے پچکار کر پوچھا جبکہ وہ سارا حادثہ دیکھ چکی تھی۔

''صیباں خراب ہوا۔''

''تم اپنے نصیب کا کچھ چارہ کیوں نہیں کرتی۔'' چراغ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اب تو مرنے کی ہی کسر بچ گئی ہے۔'' دانت پیسے۔

''یہ کسر بھی کیوں چھوڑی..... مر جاؤ شاباش!''

''ہم مر گئے تو خون آپ کے سر آئے گا۔''

''تم میرے سر کی فکر نہ کرو..... تم مرنے کا چارہ کرو۔'' ٹانگیں جھولے پر سمیٹ لیں۔

''چراغ کے سر بہت سوں کے خون ہیں کفایت! ایک خون تم اپنے سر لے لو، چراغ کا کام تما..... م..... م.....''

کہتے کہتے نظر ماں کی طرف اٹھ گئی۔ ماں کی نظر کی چنگاریاں دیکھ کر حور نے اپنا ارمان نامراد، نا تمام کیا۔ بیٹی کو گھور کر افروز چچی نے کفایت کو پچکارا، اشارہ کیا کہ اپنے زخم کی دیکھ بھال کرو۔ ''کس کس زخم کی دیکھ بھال کریں'' جاتے جاتے بھی دو آنسو گرا گئی۔ حور نے ماموں جان کو لکھا جانے والا خط مکمل کرنے کا ارادہ ترک کیا۔ چراغ نے آدھورا خط اچک کر پڑھنا شروع کر دیا۔ سلام دعا تک ہی پہنچی تھی کہ نظر اوپر مہتابی (ٹیرس) کی طرف اُٹھ گئی۔ اماں محرابی درے میں ایستادہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ مہریاں سامان اندر باہر کر رہی تھیں۔ مغرب سے پہلے تمام کام نپٹا لینے کی افراتفریاں تھیں۔

''نور جہاں بالکل ایسے ہی جھروکے میں کھڑی ہو کر دریا کا نظارہ کیا کرتی تھی۔'' چلا کر بتایا۔

حور نے کانوں کو ہاتھوں سے لپیٹ کر اسے پرے دھکیلا کہ اف یہ تیز خرافاتی آواز۔

''ماہ زیب کیسی ہے؟'' نور جہاں نیچے تشریف لے آئیں۔

''زندہ ہے.....''

''جو رقعہ اس نے بھیجا تھا اس میں اس کی آخری سانسیں چل رہی تھیں، اب کتنی سانسیں بچی ہیں؟''

''یہی کوئی بیس بائیس سال تک بچی رہیں گی۔'' شرارت سے کہا۔ چچی ہنس دیں۔

''گئی تو تم ایسے تھی جیسے نہ ملی تو قیامت آجائے گی۔''

''اگر وہ مر جاتی تو قیامت ہی کو ملاقات ہوتی۔''

''معالج کیا کہتے ہیں.....؟''

"کہتے ہیں خوش رہے، خوش شکل لوگوں سے ملے، اور ہوا خوری کرے۔"

"ہوا خوری..... بارہ دری میں..... کشتی رانی کرتے ہوئے؟"

زمین کو چھوتے اس کے آنچل کی طرف اشارہ کیا۔ پانی خشک ہو چکا تھا لیکن پانی کے نشان پکڑے جا سکتے تھے۔ ماں کے اشارے پر اس نے آنچل کی طرف سر گرا کر دیکھا۔ چہرے کا رنگ لحظہ بھر کے لیے بدلا۔ واپس آتی کفایت کے دانت نکل آئے۔ اب زخموں کو آرام تھا۔

"سہیلی کو بیمار کیا، لاچار کیا، موت کے سپرد بھی کیا..... لیکن تم نے اپنا شوق پورا کر لیا۔"

اب ساری کہانی کھل ہی گئی تھی تو وہ کیا کرتی۔ ایک بے ایمان رقعہ یہاں سے گیا کہ یہ بیمار ہیں، ایک وہاں سے آیا تھا کہ اس کی زندگی کی گھڑیاں دو تین چار ہیں۔ سات آٹھ نو، قریب المرگ لڑکیوں نے مل کر کشتی رانی کی۔ جیسے شادی کے بعد وہ زمین سے اٹھ جائے گی، اور کشتیاں دریا سمیت زمین میں دھنس جائیں گی۔

"اس کی آخری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ دریا کی سیر کرنا چاہتی ہے۔"

"توبہ توبہ چراغ بی بی! شادی کو مرن کہہ رہی ہیں، دلہن بننے جا رہی ہیں وہ۔" دانت کے ساتھ کفایت کی زبان نکلی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ بی بی سے چڑتی، وہ بھی تاک کر بے وقت لگاتی تھی۔

"دلہن بن کر مرنے جا رہی ہے..... یہ اس کے ذاتی خیالات ہیں۔" کن اکھیوں سے اماں کی طرف دیکھا۔

"ہونے والی دلہن کو دریا لے گئی۔" چچی نے خفا ہونے کی کوشش کی۔

"راوی اب جوان نہیں رہا چچی! یہ تو زمانوں سے بوڑھا ہو چکا ہے۔!"

"دریا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، اس کی طغیانی ہمیشہ جوان رہتی ہے چراغ!"

"سب پرانی باتیں ہیں کہ جوان لڑکیاں سمندر دریاؤں سے دُور رہیں۔"

"جوان لڑکیاں نہیں، جوان دلہنیں..... چراغ اس کی شادی ہونے والی ہے۔" چھوٹی بھابھی مہتاب بھی برآمد ہوئیں۔

"سودائی ہی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ دلہنیں دریاؤں سے دُور رہیں۔"

"ہم ہیں وہ سودائی....." اماں چڑ گئیں۔

"آپ سودائی نہیں، نور جہاں ہیں۔" ماں کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ گال کی چٹکی لی۔

"وہ تو تم ہو، ہر وقت شکار کے لیے تیار، ہاتھی گھوڑے پر سوار..... شہر میں گھڑ دوڑ کرتی پھرتی ہو۔" چٹکی بھرتا ہاتھ

پرے جھٹکا۔

''جھوٹ..... سب جھوٹ..... جس نے شکایت کی اس کا نام بتائیں۔''

''سارے شہر کا نام بتاؤں؟''

''اتنی سختی سے بات نہ کیا کریں، میں ہلاک ہو جاؤں گی۔'' اماں ہمیشہ اس کا دل توڑ دیتی تھیں۔

''ایک تمہارا بھائی جہانگیر ایک تم جلال الدین اکبر! ایسی جلالی ہستیوں پر سختیاں کون کر سکتا ہے۔ نوکر چاکر خبر لاتے تھے کہ باہر کیا ہنگامہ برپا ہے۔ بیرام سے کہتی ہوں تمہاری سواری کہیں چنوا دے۔'' وہ لاحاصل بیرام کا نام لے کر اسے ڈراتی تھیں۔

''ابھی مجھے جلال الدین کہا، اور اب انارکلی بنا دیا کہ میری سواری چنوائی جائے گی۔ حد ادب! ورنہ مجھے ایک دیوار آپ کے لیے بھی تیار کروانی پڑے گی۔''

''مجھے چنواؤں گی؟''

''اس پر لکھواؤں گی کہ پیاری اماں جان! جلاد کی رشتے دار! ڈانٹ پھٹکار جن کا کام! چراغ سے ناراضی جن کے معمولات! آداب عرض میری جان!'' پھر دونوں گال پکڑ کر کھینچے۔

چچی بے ساختہ ہنس دیں۔ اماں خفا ہی رہیں۔ واپس لوٹ گئیں۔ کفایت کے ارمان دل میں ہی رہ گئے۔ خطاء ہے جو کبھی اس کے زخموں پر بھی پھوار پڑی ہو۔ ہمیشہ نمک ہی گرتا تھا۔ اسے واپس کاموں کی نگرانی کے لیے جانا پڑا۔

''اماں بی کو سب معلوم ہو جاتا ہے، پھر بھی تم جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتیں۔'' یہ حور ہے، چچی کی بڑی بیٹی۔

''اگر چہ داغ کھائے بہت..... پھر بھی باز نہ آئے ہم.....''

''کس شعر کو تباہ کیا ہے؟''

شعر سے اسے شیر یاد آئے۔ اس کی سواری خضری دروازے سے گزری تو دائیں بائیں بیٹھے دونوں شیر دھاڑے تھے۔ اس نے سر گھما کر کھڑکی سے انہیں دیکھا..... دیکھا کہ ان کی گرج سے کیسے دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔

''اگر ہم اپنی حویلی کے باہر دو شیر رکھ لیں تو ہر دل پر ایسے ہیبت طاری ہو گی۔'' بلند آواز سے کہا۔

ہل چل، افراتفری، اور چراغ کا ہیبت ناک خیال..... مہریوں کو کام سمیٹنے کی ہدایات دیتی اماں تھم سی گئیں۔ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ''خطاء نہیں کہ اس کا بھائی شیر لے ہی آئے۔'' بڑبڑائیں۔ کفایت پھر سے مچان پر چڑھ چکی تھی، اب دیوار گیر شمع دانوں کی جانچ ہو رہی تھی۔ اس کے کان میں آواز پڑی تو، ''ہم غریبن کو اٹھا لینا خدایا'' زبان سے دہائی نکلی۔

''پھر تم اکیلی ہی رہنا حویلی میں۔'' ماموں کو لکھا جانے والا خط بگڑ چکا تھا۔ نیا خط وہ کمرے میں جا کر لکھے گی۔

''ظاہر ہے اکیلا ہی رہنا پڑے گا..... تم سب کو تو شیر چیر پھاڑ کر کھا چکا ہو گا۔''

''دو وقت مل رہے ہیں چراغ! کیا اول فول کہہ رہی ہو۔'' چچی کتنی جلدی ڈر جاتی تھیں۔

وہ احاطے کے مرکز میں کھڑی تھی۔ اور حویلی اس کے اطراف گھری کھڑی تھی۔ شمعیں روشن ہو رہی تھیں۔ قندیلیں جل اٹھنے کو تھیں۔ چچی کی بات پر سر پیچھے کی طرف گرا کر ہنسنے لگی۔ گردن کی رگیں جھلمل ہوئیں۔ یہ ہنسی حویلی کے در و بام میں اولین نقارے کی طرح گونجیں۔ زمین کو چھوتا آنچل، آنکھوں کی شرارت، چراغ چراغ ہستی..... اس کے آباو اجداد قلعہ معلیٰ کے جانثاروں میں سے تھے۔ اس میں شاہی خون نہیں تھا، لیکن شاہی آن بان ضرور تھی۔

''چچی دو وقت ملنے سے نہیں دو دل ملنے سے ڈرنا چاہیے۔''

اس کی بے باکی سے چچی گلال ہوئیں۔ دل ہنگام ہوا۔ چچی کو دو وقتوں کے ملاپ میں دو دلوں کی بات پر وہم ہوا۔ حویلی میں مشہور تھا کہ چچی کے وہم اور دھڑکے سچ ہو ہی جاتے ہیں۔

''دو دل ملنے سے ڈرنا چاہیے۔'' چچی نے زیر دل کہا۔

شاہی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی.....

اور.....

شہر کی فصیل کے گرد ایک گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا.....

گھڑ سوار بھیگا ہوا ہے.....

کیونکہ وہ ''بارا'' ہوا ہے.....

☆.....☆.....☆

ہر رنگ سے بھیگا آسمان.....

ہر رنگ کی ترنگ سے جھومتا آسمان.....

اسی آسمان پر بہار کے رنگ پتنگ بن کر اُڑنے پر کمر بستہ ہیں۔ ہلچل ہے، ہنگامہ ہے۔ خوشیاں اور بے فکریاں ہیں۔ کوچہ رنگ ریزاں بسنتی ہے۔ گلیوں، چوباروں، مکانوں سے رنگ جھلکتے ہیں۔ رنگ ریزرات دن رنگ سازی کرتے ہیں۔ بسنتی پگڑیاں، رنگ برنگ آنچل۔ ڈولیوں اور سواریوں کی آمد آمد ہے۔ سب میکے آ چکی ہیں۔ اماں کی چچازاد، پھوپھی زاد..... یہ بہن، وہ بہن، سب بہن بیٹیوں کی ڈولیاں اتر چکی ہیں۔ ان کے بچوں سے حویلی میں مینا بازار لگ چکا ہے۔ جو کوئی

اس کے قریب و جوار سے گزرتا ہے، رو کر پلٹتا ہے۔ معصوم صورتوں پر اسے پیار آتا ہے نہ ترس۔

''بڑے گھر میں رہتی ہو، دل بھی بڑا رکھو۔'' اماں نے تحمل سے سمجھایا۔

''یہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے جب وہ میرے کمرے کی چیزیں توڑتے ہیں، آپ کمرے کو بند بھی نہیں کرنے دیتیں۔''

''مہمان آئیں تو دل اور گھر کے دروازے کھول دیتے ہیں، بند تو کم ظرف کرتے ہیں چراغ! جو ٹوٹے گا میں نیا بنوا دوں گی۔''

''لگاؤ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' آنکھیں گھمائیں، گردن اٹھالی۔

''تمہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں ہوتا، تمہیں صرف ضد ہوتی ہے۔ کتنے پیار سے تمہارے لیے تحائف لاتی ہیں، تم توڑ دیتی ہو، پھینک دیتی ہو۔''

''پھینک دینے والی چیزوں کو پھینک دینا چاہیے، توڑ دینے والی کو توڑ دینا چاہیے۔'' لاپرواہی سے کہا۔

''کیوں اپنی بہنوں کا مان توڑتی ہو..... ان کا دل برا ہوا تو کس جی سے واپس آئیں گی۔''

''بہنیں؟ کیوں بہلا رہی ہیں ..... کچھ تو رشتے میں میری نانیاں، دادیاں تک لگتی ہیں۔''

دونوں اُوپر اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ اسی کھلی کھڑکی سے سر نیچے گرا کر کے نانیوں دادیوں کا اجتماع دیکھا۔ سارے ہندوستان سے نامعلوم کس کس رشتے سے کون کون سی بہن بیٹی کو چہ سسرال سے آئی تھی۔ بہار آتی نہیں تھی کہ ان کی سواریاں حویلی اترنے لگتی تھیں۔ اماں بھی ڈھیروں خط لکھواتی تھیں۔ پیغام الگ بھجواتی تھیں۔ آدھا تو دلی ہی اٹھ آتا تھا۔ پھر دن میں دل کی باتیں ہوتیں۔ رات میں دل کے درد بیاں ہوتے۔

''آپ امیرن آپا ہیں جو بیاہ کر فیروز پور گئیں۔''

امیرن آپا نہیں بوا تھیں۔ ان کو وفات پائے بھی تین سال ہو چکے تھے۔

''یہ فخر جہاں ہیں، تمہاری بڑی پھوپھی جان کی منجھلی بیٹی!'' اماں پچھتاتیں کہ کیا ضرورت تھی چراغ سے سامنا کروانے کی۔

''آہ میری فخر آپا! وہ جن کا رشتہ ختم ہوا تو انہوں نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔''

''وہ تمہاری پھوپھی جان کی منہ چڑھی خادمہ تھی، بچی کی نادانی تھی، اب اپنے گھر خوشحال آباد ہے۔'' بے بس اماں۔

''وہ ناداں خدمت گار بچی بھی آئی ہوگی، ان سے نہیں ملوایا آپ نے۔'' بدلحاظ چراغ۔

امیرن بوا، مطلب فخر جہاں گود کی بچی کو بہلاتی کھسک گئیں۔ اماں کو کیسا افسوس ہوا۔ دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

''آنے والیوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور تمہاری بدتہذیبی میں۔ کئی بچیوں کے میکے اجڑ چکے ہیں، وہ یہاں آ کر بہل جاتی ہیں۔ آئندہ تم نے کسی بچی کا دل دکھایا تو اچھا نہیں ہوگا چراغ!''

''میں آپ کی بچی نہیں ہوں؟'' کہہ کر اپنی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو لے آئی۔ ہنستے کھیلتے بچوں کو رلا دینے والی خود رو کر دکھا رہی تھی۔ جھوٹی..... ظالم..... خودغرض.....

''کچھ نہیں ہو تم میری.....'' اماں جھلا کر چلی گئیں۔

زخم جھیلے، داغ بھی کھائے بہت

دختر بن کر ہم تو پچھتائے بہت

''میر کے حال پر رحم رکھنا چراغ!'' جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ انہیں میر کتنا عزیز تھا۔

در و دیوار سن کر روتے ہیں

آہ مگر تم تک نہیں جاتی

میر پر رحم کیا..... صاف سیدھا ماں کے حضور درد پیش کیا۔

درد..... میر کا درد.....

☆.....☆.....☆

رات میر درد میر تھی۔ دلی والوں نے جگا کر، بھڑکا کر رکھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو حصوں میں تقسیم ہوئیں اور شعر پر شعر کہنے لگیں۔ نشست گاہ قہقہوں سے بھڑکتی جھڑکتی رہی۔ ''چراغ کیا کہتی ہے؟'' چچی نے اماں کے کان میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئی۔ ''کچھ میر اور کچھ درد کہتی ہے۔'' خفگی سے منہ بنا لیا۔ حور کو پھر اشارہ کیا کہ جاؤ اسے آنے کا کہو۔

''دیوانِ میر میں میری جگہ نہیں بنتی۔'' وہ دالان میں ٹہل رہی تھی۔ دراصل ناراض تھی۔

''سچ یہ ہے کہ تمہارا انسانوں میں دل نہیں لگتا، تم پری جو ہو۔ اگر یہاں کسی پری زاد کے انتظار میں ٹہل رہی ہو تو انتظار موخر کر دو، تم جیسی پریوں کے لیے پری زاد نہیں ''دیوزاد'' آیا کرتے ہیں۔''

''آج رات تم رو کر سونا چاہتی ہو؟''

''رو کر وہ سویا کرے جو تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے..... مطلب دیوزاد.....''

کہہ کر بھاگ گئی۔ نشست گاہ میں جا کر دم لیا۔ ماں کو اشارہ کیا کہ وہ نہیں آتی۔ جو نہیں آتی تھی اس نے خفگی سے

نشست گاہ کی کھڑکی سے جھانکا۔ وہاں سے راتاں، باتاں، دیوان ابن دیواناں اُمڈ رہے تھے۔ مردانے کے اپنے ہنگام تھے۔ لیکن اماں کا زنان خانہ پھر بازی لے گیا تھا۔

بازی گر آگ کے الاؤ کے قریب سے گزرا۔ الاؤ میں بتاشے گرے اور چنگاریاں بھڑکیں۔ ''کمال است'' اس نے دلچسپی سے الاؤ میں بتاشے گرتے دیکھا۔ گلی کوچوں، بازاروں، راہ کناروں آگ کے الاؤ روشن تھے۔ اس میں بتاشے، تل پھینکے جا رہے تھے۔ مکانوں مچانوں سے لوگ باگ الاؤ دیکھنے، الاؤ سینکنے گلی در گلی نکل رہے تھے۔ شہر نیند کے لیے تیار نہیں تھا۔ شہر دلبری پر کمر بستہ تھا۔ وہ روشنائی دروازے کی محراب کے عین نیچے آ کر کھڑا ہوا۔ سر اٹھا کر، سر گھما کر دیکھ رہا تھا۔ مسجد اور قلعے کی روشنیاں مل کر سارے شہر کو حصار میں لے رہی تھیں۔ اس نے اتنی روشنیاں ایک ساتھ پہلی بار دیکھی تھیں۔

''عروس البلاد.....'' بے اختیار کہا۔

شہر عروس البلاد تھا اور یہ دروازہ ''عروس الباب''۔ چراغاں چراغاں جیسے کسی کی آمد کا جشن اب تک منا رہا ہو۔

آمد پر جشن.....

بابا حضوری باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ اطلاع دینے والا بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا اور اکلوتی بیٹی کی پیدائش کی خبر دی۔ شام کے گہرے سائے تھے۔ قلعے اور مسجد پر رات کی روشنی کا انتظام ہو رہا تھا۔ خبر خوش کن تھی، یا پھر وقت ہی روشن تھا کہ ایسا لگا سارا شہر یکدم روشن ہو گیا۔ وہ گردن گھما کر چاروں اطراف دیکھنے لگے۔ حیران ہونے لگے۔ انہیں یہ خطہ کبھی اتنا روشن نہیں لگا تھا۔ باغ سے دروازے تک پہنچنے تک روشنائی دروازہ چراغاں چراغاں ہو چکا تھا۔ تیزی سے حویلی کے اندر آئے، اسے گود میں اٹھا کر بس اتنا کہا ''میری چراغ''۔

ان کی چراغ..... اماں کی چراغ..... باقی دنیا کی سانس گل کرتی چراغ!

☆.....☆.....☆

چھم چھم کی آواز کے ساتھ اماں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھا، پھر اس کی طرف۔ دلی والی بہن خاص اس کے لیے پازیبیں بنوا کر لائی تھی، وہی پہن کر گھوم رہی تھی۔ ''شادی کے لیے اٹھا رکھتیں چراغ!'' اماں کو اس کی جلدی بازی پر افسوس ہوا۔

''آپ تو چاہتی ہیں میں ہر چیز بڑھاپے میں پہنوں۔'' چچی کو دیکھ کر آنکھ دبائی۔ چچی ایسے گلال ہوئیں جیسے ان کی شادی کا ذکر ہو۔ پازیب والی بہن ہکا بکا چراغ اور چچی کو دیکھ رہی تھی۔

''میں شادی کے لیے اور لا دوں گی۔'' اسے پازیب پسند آ گئی، بہن نہال ہو گئی۔

''شادی پر مجھے ایسا معمولی تحفہ دیں گی۔''

نہال بہن ہکلا کر رہ گئی۔ اماں کے چہرے کا رنگ سمٹ گیا۔

''آپ کی دعاؤں کے آگے ہر چیز ہیچ ہوگی آپا!'' اماں کی ممکنہ تیوری کا لحاظ کرتے ہوئے کہنا پڑا۔ کتنی مجبور تھی وہ۔

آپا بہل گئیں، نہ بھی بہلتیں تو کیا کر لیتیں۔ آنے والے اپنی حیثیت سے بڑھ کر تحائف لاتے تھے کہ شاید وہ خوش ہو جائے۔ اور وہ اتنا خوش ہو جاتی تھی کہ انہیں نیست و نابود کر دیتی تھی۔ توڑ دیتی، پھینک دیتی تھی۔

''تم ناقدری ہو چراغ! محبت کی قدر کرنا سیکھو۔'' پازیب والی آپا کا دل دکھانے پر اماں کا ملال کیسے کم ہوتا۔

''محبت..... اس بھری حویلی اور اتنی بڑی دنیا میں مجھ سے محبت کرتا ہی کون ہے۔ ستم سہتی، طعنے سنتی ہوں۔ کیا میں دنیا میں اس لیے بھیجی گئی ہوں کہ مجھ سے ایسا سلوک قائم رکھا جائے؟''

''نہیں! بلکہ اس لیے کہ ہمارا سکون برباد ہوتا رہے۔'' ہاتھ سر تک لے جا کر اشارہ کیا کہ جاؤ بی! میرا سکون تباہ نہ کرو۔ مزید اسے جلانے کے لیے پازیب والی آپا کی بچی کو گود میں بھر کر منہ چومنے لگیں۔ اس نے منہ بنا لیا۔ آنکھیں چڑھا لیں۔

''دستور ہے کہ چراغ کو چراغ پا کیا جائے۔''

آواز رندھ گئی۔ کیسے ماں نے ہاتھ سے دفع دُور ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔ بے عزتی کی، رسوا کیا۔ وہ اس شہر سے ہی کہیں دُور چلی جائے۔ جنگل میں بسیرا کرے، کبھی کسی کو اپنی صورت نہ دکھائے۔ اسے شیر کھا جائے۔ بلکہ چیر پھاڑ دے۔ اماں کو اس کے خون آلود کپڑے ملیں۔ سب مل کر خوب روئیں، پھر بھی وہ واپس نہ آئے۔ اس نے پیر پٹخے اور جنگل کی طرف چلی گئی۔ چچی نے آواز دی، لیکن وہ رکی نہیں۔ غصے سے اماں کی چہیتوں کے ہجوم میں گھسی تا کہ سب اس کی ناراضی جان جائیں۔ اس ہجوم کو تہہ و بالا کر کے چلنے لگی۔ احاطہ، دالان، پھر سیڑھیاں..... چھم چھم..... کسی نے روکا، کچھ پوچھا..... خفا خفا چال..... خفا خفا جواب..... چھم چھم.....

''چراغ خفا ہے؟'' کسی نے اماں سے پوچھا۔

''خفا ہی رہے.....'' بے اعتنائی سے جواب دیا۔

خفا چراغ..... خفا آسمان.....

دن کے آسمان پر رنگین ستارے اڑ رہے ہیں۔ بہار بھیس بدل چکی ہے۔ اوپر کا حال نیچے سے الگ نہیں تھا۔ گماں ہے سارا شہر حویلی کی چھت پر براجمان ہے۔ یہ روشنائی دروازے کی روشن اور پرجلال حویلی ہے۔ جیسے قلعے کی حشمت سے بچھڑ کر

یہاں آ کھڑی ہوئی ہو۔ دادا نے قلعے کی محبت میں بنوائی ہو گی، ورنہ رعب میں۔ انہیں بہت شوق تھا کہ چوکھٹیں پر جلال ہوں ۔ چوباروں سے حشمت جھلکے کہ آنکھ اٹھے تو جان کی امان کا خیال رہے۔ جہانگیر کی زنجیر، اور فریادیوں کی کمی رہ گئی تھی۔ لیکن دادا نے اپنی پہچان میں کمی کوئی نہیں رہنے دی تھی۔

حویلی کی پہچان بیرام جنگ کا سر بلند ہے۔ وہ حویلی کو اپنا تخت، شہر کو سلطنت سمجھتا ہے۔ اسی سلطنت کے آسمان پر اڑنے والی ایک خاص پتنگ اس کی نظر میں ہے۔ جو جھکتی نہیں۔ جو کٹتی نہیں۔ شکار ان کا شوق ہے۔ میدان کوئی بھی ہو، ان کی شست بندھی رہتی ہے۔

حقے کی نے ہونٹوں میں ہے، اور شست آسمان پر.....

وہ چھت کے دوسرے کنارے کی کوٹھری میں کھڑی تھی۔ یہاں چھت کے تخت، چاندنیاں، غالیچے اور روشنی کا سامان رکھا جاتا ہے۔ سب سامان باہر سجا تھا۔ وہ جعفری کے ساتھ لگ کر کھڑی آسمان دیکھ رہی تھی۔ آغائی نے وعدہ کیا تھا کہ بھیڑ چھٹے گی تو وہ اسے پتنگ اُڑا دیں گے۔ وہ ہر شے کو خفا خفا دیکھ رہی تھی۔ ارمان تھا کہ کچھ تہس نہس کر دے۔ کئی بار جھانک کر دور نیچے دیکھا۔ وہاں سب ہنستی مسکراتی تھیں۔ کفایت تک کو اس کے پیچھے نہیں بھیجا گیا تھا۔ سب کے دل اس کے بغیر ہی راضی تھے۔ کچھ اس لیے بھی وہ مر جانا چاہتی ہے کہ کسی کو چراغ کی پرواہ ہی نہیں۔

یکدم شور اٹھا..... چراغ سہم گئی۔ وہ پتنگ کٹ چکی تھی جس پر بیرام نے شست باندھی تھی۔ چھت پر ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ نیچے عورتوں کے دل دہل کر رہ گئے۔ اسی ہنگامے، اسی جشن میں جلتی ہوئی مشعلوں پر سیال انڈیلا گیا۔ انہیں اٹھا کر لہرایا گیا۔ رنگ برنگ چنگاریوں کا اژدھام برپا ہو گیا۔ کیا خوبصورت منظر تھا..... دن ڈھل چکا تھا..... شام کی آمد تھی..... اور بسنت رنگ پھلجڑیوں کا دھواں تھا۔

رنگ برنگے شعلے..... رنگ برنگ دھواں.....

انہی چنگاریوں کی دھند میں سے ایک ہیولا بھاگتا ہوا دکھائی دیا..... دور سے..... دور سے ہی..... کئی چھتیں پھلانگتا، کودتا، چوہدری دلاور کی حویلی سے ہو کر لالہ رام لال کی حویلی کی چھت پر بھاگتا ہوا..... ایک دیوار سے دوسری پر ہاتھ رکھتا، لمبی جست لگاتا اور اگلی حد بندی پر پہنچتا ہوا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے....."

بیرام نے اپنی طرف آنے والے کی کود پھاند کو دلچسپی سے دیکھا۔ پھلانگنے والے میں ایسی جرأت اور مستعدی تھی کہ کئی لوگ اس کی طرف گھوم گئے۔ وہ بے دھڑک بھاگ رہا تھا۔ جیسے اسے یہ عہد حاصل تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا۔ بیرام نے اپنی

ڈور کسی کے سپرد کی۔اور ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا۔لالہ رام لال کی چھت ختم ہوئی۔حویلی کی حد بندی شروع ہوئی۔وہ حویلی کی طرف بڑھا۔اچھل کر منڈیر پر چڑھا۔منڈیر پر چلتا رہا اور جست لگا کر حویلی فتح کر لی۔سب اسے دیکھتے رہ گئے،وہ کیسے قلعہ پھلانگتا پھر رہا تھا۔

''میری پتنگ آپ نے کاٹی ہے؟''اتنی بلندیاں سر کرنے پر بھی اس کے سانس سلامت تھے۔

''تم وہاں سے یہ پوچھنے آئے ہو؟''بیرام نے اس کی لمبی مسافت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''بالکل!''اسے معلوم تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''ایک وقت سے اس پر نظر تھی،کاٹ دی۔''

''میں اپنے آسمان پر اڑا رہا تھا،آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

یعنی آسمان بھی اس کا ہوا۔کیا وہ اپنی چھت،اپنا مکان کہنا نہیں جانتا تھا۔

''کیا کرنا چاہیے تھا؟''بیرام محظوظ ہوا۔

''شرافت سے پتنگ اڑائیں.....''

''پھر پتنگ بازی کسے کہتے ہیں؟''

''وہ میں نہیں جانتا.....لیکن ایسی بے ایمانی میری چیز کے ساتھ نہیں چلے گی۔''

''بے ایمانی.....''بیرام نے اپنی ٹھوڑی رگڑی۔''پتنگ کاٹنا بھی بے ایمانی ہوتا ہے مجھے آج معلوم ہوا ہے۔''

''آپ نے کاٹ لی،اب لوٹا دیں؟''ہاتھ آگے کیا۔

''اسے کوئی سمجھائے کہ پتنگ بازی کسے کہتے ہیں۔''بیرام جنگ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''مجھے یہ بازی،وہ بازی،کچھ نہیں سمجھنا۔''

''میں سمجھا دیتا ہوں۔''

''آپ نے سمجھایا تو آپ کو ساری بازیاں ہارنی پڑ سکتی ہیں۔''

یہ بازی.....وہ بازی.....ہر بازی.....

سناٹا.....

بیرام جنگ کو غیر محسوس ایک جھٹکا لگا۔''خوب.....کون ہو تم؟''

''انسان ہوں.....دیکھ سکتے ہیں آپ.....''کچھ بھولپن سے،کچھ چڑ کر کہا۔

بے شمار قہقہے۔ ''اچھا تم انسان ہو، ہمیں لگا صرف ہم ہی بندر ہیں۔ اچھا انسان صاحب! پہلے کبھی دیکھا نہیں آپ کو..... نئے لگتے ہو، پرانے ہوتے تو ایسی جرأت نہ کرتے۔'' جس نے کہا اس نے ہاتھ بڑھا کر گال تھپتھپانے چاہے۔ اس نے سر پیچھے کھینچ لیا۔ کیسا گستاخ انسان تھا۔ اس گستاخی پر ایسی سزا مل سکتی تھی کہ مقبرے کی جگہ قبر بنتی۔ زمین میں کھدی نہیں، چنی ہوئی۔ سب کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اسے غصہ آیا لیکن ضبط کر گیا۔

''اپنی چیزوں کے لیے جرأت میں کیسی شرم۔'' منڈیر پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

وہ سب بے شرموں کی طرح ہنسیں۔ اور پھر جسے نئی نئی بازی گری سکھائی تھی اس کے ہاتھوں اپنی پتنگیں کٹواتے رہے۔ اس کی پتنگ کٹنے پر جو ہنگامہ ہوا تھا، وہ دوبارہ نہیں ہو سکا۔ جس پتنگ نے سر اٹھایا، اس کا سر قلم ہوا۔ مغرب تک سناٹا ہو گیا۔ سب جا چکے۔ اندھیرا گل اور شمیں روشن ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

دُور کئی چھتوں پر الاؤ روشن تھے۔ لالہ رام لال کی حویلی کی عورتیں اور بچیاں چھت پر چہلیں کرتی پھر رہی تھیں۔ وہ کوٹھری سے باہر نکل آئی تھی۔ نیم اندھیرے کونے میں کھڑی پتنگ اُڑانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی کہ کوئی دھڑام سے چھت پر کودا۔ پتنگ اس کے ہاتھ سے پھسل کر گر گئی۔ کونے میں پتنگیں رکھی تھیں وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔ ایک ایک کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ غصے سے اس کے پیچھے لپکی۔ اپنی پتنگ پہچان چکا تھا۔ اسے الگ کر چکا تھا۔ جھکا ہوا تھا، سیدھا ہوا تو جیسے ان کے گھوڑے ٹکرائے تھے، ویسے دونوں ٹکرا گئے۔

''خدائی من.....'' سر ٹکرایا۔ وہ ذرا سا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

اس سہم پر وہ بری طرح سے چونک کر پلٹا..... خدائی..... دہائی..... رہائی.....

''ایسے کیسے اٹھا کر لے جا رہے ہو۔'' سہم پر قابو کرتے ہی چلائی۔

سہما دینے والے نے ایک نظر اسے، ایک نظر پتنگ کو دیکھا۔ روشنی اتنی تو تھی کہ اس نے اس کی درشتی دیکھ لی۔

''رکھو واپس.....'' حکم..... حکم.....

حکم عدولی کرتے ہوئے دو قدم پیچھے کھسک کر حویلی کی بلندی پر چڑھنے ہی لگا کہ وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں بازوؤں کو پھیلا کر راستہ روک لیا۔

''سن نہیں سکتے کیا کہا ہے۔'' غصے سے لپکی تھی نا، چھم چھم سے چھت گونج اٹھی تھی۔

''سارا شہر سن سکتا ہے۔''(جیسے چلا رہی ہو)

''چوری اور زبان درازی۔''بھنا گئی۔

زبان دراز چور نے چوری شدہ مال کی طرف دیکھا۔

''رکھو ورنہ دیوار سے نیچے پھینک دوں گی۔''

''اگر تم راستہ چھوڑ دو تو میں خود ہی چھلانگ لگانا چاہتا ہوں۔''سنجیدگی سے بتایا۔یاد دلایا۔

ایسا بھڑکیلا جواب سن کر وہ بھڑک اٹھی۔''تماش گاہ کے بندر کی طرح اچھل کود کو بہادری سمجھتے ہو۔''

تماش گاہ کا بندر ایک سے ایک نئے الزام پر حیران ہوا۔''تم جسے بہادری سمجھتی ہو وہ کر کے دکھا دو۔''

''مجھے مسخرہ سمجھا ہے.....''

''میں تو دونوں کو ہی نہیں جانتا،تم ہی بتا دو کون ہو تم.....''

کون ہو تم.....بندر یا مسخرہ.....

''رکھو واپس.....''دوبارہ وہی سوال دہرانا پڑا۔

وہ رکھ دیتا دل اس کے قدموں میں لیکن پتنگ وہ لے کر ہی جانے والا تھا۔ابھی اس نے اپنی چیزیں دینا دلانا نہیں سیکھا تھا۔

''ہمیں چور سمجھا ہے کہ تمہاری پتنگ چرا لی؟ایک پتنگ کو پیشانی کی سیاہی بنا دیا.....کیا لین دین نہیں سمجھتے، جو کٹے گی،ہاتھ لگے گی وہ اسی کی ہوگی۔''پتنگ بازی کے فرمان جاری کیے۔

وہ لین دین نہیں جانتا تھا۔جو دل سے گیا وہ جان سے بھی گیا،ابھی وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

''لاؤ دو ادھر یہ.....یہ اب ہماری ہے.....''اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

وہ حکم دے رہی تھی اور ہاتھ بھی پھیلاتی تھی۔وہ حیراناں،پریشاناں۔یہ آفتاں وطوفاناں۔

''دو.....''وہ زبردستی لے رہی تھی،یہ بات یاد رکھی جائے۔ہاتھ کو جھٹکا دیا کہ دے دو۔

''نہیں دوں گا.....''اس کی چیز کو ہماری کہہ رہی تھی،بہت عجیب تھی۔

''یہ یہیں چھوڑنی ہوگی۔''

''میں اپنی چیزیں ایسے نہیں چھوڑتا۔''بے ساختہ کہہ دیا۔خود بھی نہیں جانتا تھا کیوں کہا۔

''ہم اپنی ناک کے نیچے سے لے جانے والے کو نہیں چھوڑتے۔''

اماں کی پھٹکار، حویلی کا شور ہنگام، اور باقی اس کا دو بدو جواب۔ وہ تہس نہس کر دینے کے رنگ میں تھی۔ اسی رنگ میں ہاتھ بڑھا کر جھپٹ لینی چاہی۔ سرعت سے اس نے بھی پتنگ والا بازو اُوپر اٹھالیا..... اور وہ اس کے سینے پر گری..... وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوا۔

اس نے ابھی کہا تھا نا وہ اپنی چیزیں ایسے نہیں چھوڑتا.....

وہ اس کی آنکھ کے نیچے سے چرا لے جانے والا تھا.....

چور چور.....

شہر کے کسی کونے سے بگل کی گونج ہوئی.....

وقت دنگ رہ گیا اور وہ بھی۔ طیش سے اس کا یہ حال تھا کہ آغائی کا ہتھیار اٹھائے اور اس کے سینے میں اتار دے۔ جس کے سینے پر جا گری تھی وہ اس کے غصے سے ڈر گیا۔ یا پھر اس کی ہار پر افسردہ ہوا کہ ہاتھ نیچے کیا۔ پتنگ اس کی طرف بڑھا دی۔

''بہتر..... یہ لے لو.....'' اس نے اپنی چیز دے دی۔

اس کی چیز جھٹکے سے کھینچی اور طیش سے پکڑ کر پھاڑ دی۔ پھر اپنے پیروں کے نیچے مسلنے لگی۔ دے کر حال بھی دیکھ لیا۔

''اب دفع ہو جاؤ..... دوبارہ چھتیں پھلانگ کر نہ آنا، تم گنوار لگتے ہو لیکن یاد رکھنا ہم گنوار نہیں ہیں۔ کان کھینچ کر، کھال اتار کر ہاتھ میں دیں گے۔ یہ حویلی یاد کر لو، ہو سکتا ہے اگلی بار آؤ تو یہاں تم الٹے لٹکے ہو اور نیچے سے سب تمہیں جوتے مارتے ہوں۔''

وہ سیدھا کھڑا تھا، چپ تھا۔ وہ نہ بھی کہتی تو اسے یہ حویلی یاد رہنے والی تھی..... یہ آواز..... یہ للکار..... یہ.....

وہ اسی طیش سے گھوم کر نیچے جانے لگی تھی کہ اب وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''جوتے لینے جا رہی ہو؟''

وہ اس کی جرأت پر دنگ رہ گئی۔ ''تم نہیں جانتے تم کہاں کھڑے ہو۔''

اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''آسمان کے نیچے.....''

''اسی آسمان کے نیچے کھڑے رہنا، جوتے کھا کر جانا۔''

''منظور ہے۔''

وہ دنگ اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

ای دیگرم.....اوشدیدم.....

''جانتے بھی ہوتمہارے سامنے کون کھڑی ہے۔''وہ اسے لاجواب طورز چ کر چکا تھا۔

''لڑکی.....''سنجیدگی۔

''بکری تو ہونے سے رہی.....نام وام جانتے ہو؟''نام سے اس کا مطلب مقام تھا،جلال تھا۔

''ابا جی کہتے ہیں لڑکیوں کے نام نہیں ہوتے وہ اس کی بیٹی اس کی بہن اس کی.....''

''اس کی زوجہ ہوتی ہیں؟''اس نے بے شرمی سے اس کی بات مکمل کی۔وہ دم بخود رہ گیا۔

''اور کیا جانتے ہو؟''

''شہر کے لوگ چالاک،مکار،بدتمیز،منہ پھٹ اور بے حیا ہوتے ہیں۔''جس پر دم بخود ہوا،وہ کہہ دیا۔

''مجھے بے حیا کہہ رہے ہو؟''

''شہر کے لوگوں کو۔''اس نے''مجھے''پر اتنا زور دیا کہ اسے بات شہر والوں پر رکھنی پڑی۔بے چارہ چور۔

''بہ طرز خیرہ (حیران کن)!بات اگل بھی دی اور فصل بھی نہیں جلی،ہمت ہے تو صاف کہو۔''

''ہاں!تم بے حیا ہو.....بدلحاظ اور مغرور بھی.....''بات گل ہوئی اور ہاں فصل بھڑک اٹھی۔

اس نے شانے سے پھسل کر زمین پر گرتے آنچل کو پکڑ کر گھسیٹا اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

''مجھے بہت شوق تھا کہ کوئی گنوار دیکھوں.....خوب.....خواہش پوری ہوگئی۔دیکھنے کی بھی اور سبق سکھانے کی بھی۔دوسروں کو رسوا کرنا تمہارا دستور لگتا ہے،معاف کرنا میرا دستور نہیں ہے۔بھول کر بھی کبھی اس بے حیا کو اپنی شکل نہ دکھانا۔''

سرخ گال اور سرخ آنکھیں۔اب اس کی سانس تیز ہوئی۔جھک کر اس کے پیروں میں پڑی پتنگ اٹھانی چاہیے۔تھپڑ کھا کر بھی وہ اپنی چیز لے کر جانا چاہتا تھا۔تھپڑ مار کر بھی اس کے دل کے ارمان پورے نہیں ہوئے تھے۔اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور پوری قوت سے مسل دیا۔جھکے جھکے اس نے سر اٹھا کر مسلنے والی کو دیکھا۔

''یہ شام یاد رہے گی۔''مسل کر سیڑھیوں کی طرف پلٹ گئی۔

یہ شام ساتھ رہے گی.....

وہ دیوار پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔کودنے ہی والا تھا کہ غیر ارادی رک گیا.....گال کی سرخی قائم تھی۔اس گال سمیت سر کو ترچھا کر کے اس طرف دیکھا جس طرف وہ گئی تھی.....آنچل زمین کو چھو رہا تھا.....آنچل کہ جس کے کنارے پر گہرا ناری

رنگ تھا اور کچھ جھلمل ستارے..... وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی..... چھم چھم ہنگام خیز تھی..... اتنی کہ گھڑ سوار نے اپنے گھوڑے کے ٹاپوں کو اتنا پرشور نہیں پایا تھا۔ پہلے پانی میں گرا تھا اب حویلی سے گرنے والا تھا۔

گھڑ سوار.....

انجام شدہ..... سزا شدہ.....

☆.....☆.....☆

ابا جی تہجد کے لیے اٹھے تو وہ جاگ رہا تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اس وقت وہ بے خبر سویا کرتا تھا اور اب کروٹیں بدل رہا تھا۔ کتنا شرمندہ ہوئے۔ سوچا اس گناہ کی توبہ کیسے کریں۔ شاید خطاء ہوئی جو اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ گاؤں کی دھڑکن تھا۔ اب گاؤں کا دل تو کیا مردہ ہوا ہوگا، اس کا اپنا ہی دل بجھ چکا ہوگا۔

''رات بھر جاگتے رہے ہو؟'' باپ بیٹے کے معاملات ایسے تھے کہ وہ بے تکلفی سے اس کے بستر پر نہیں بیٹھ سکے۔

''شاید.....'' وہ ادب سے اُٹھ کر بیٹھ گیا ورنہ استاد سے گستاخی کا مرتکب ٹھہرایا جاتا۔

''کچھ ہوا ہے؟'' اس کے بکھرے بالوں کو محبت سے سنوارنا چاہا۔ خواہش کو دبانا پڑا۔

''ایک غلطی ہوئی.....''

''توبہ کرلو.....'' وہ جتنا شریر تھا اتنا ہی بے نیاز۔ اس کا ناپ تول تو پھوپھی کو سمجھ نہیں آ سکا تھا، وہ کہاں سمجھتے۔

''توبہ کرلینی چاہیے..... معافی مانگ لینی چاہیے.....؟'' آنکھیں یکدم چمکیں۔

''کیوں نہیں..... خطاء کیا ہوئی؟''

''ایک لڑکی کو بے حیا کہہ دیا۔ اس نے کہا رسوا کرنا میرا دستور لگتا ہے..... معافی مانگ لوں اس سے؟''

امام صاحب ٹھٹکے۔ گڑبڑا گئے۔ ''کسی لڑکی سے بات کی..... دوبارہ نہ کرنا، بے شرم کہلاؤ گے۔''

''بات بھی کی اور چوری بھی..... وہ میری چیز کو ''ہماری'' کہہ رہی تھی۔'' اسے اس ہماری ہماری نے رات بھر جگا کر رکھا۔

وہ سمجھ نہیں سکے کہ اسے کیسے سمجھائیں۔ ''یہ امراء و روسا کا شہر ہے میرے بیٹے! یہاں حویلیوں اور تاجروں کی کمی نہیں! اسے گاؤں نہ سمجھنا۔ شہر کے دروازے رات کو ہی بند نہیں ہوتے، ان کے حکم پر بھی ہوتے ہیں۔ ہتھیاران کی دیواروں کی زینت ہیں اور ان کی حیثیت کے بھی۔ مجھے اپنی تو کیا پرواہ ہوگی، تمہاری جان پر آنچ آئی تو میرا جینا مرنا دونوں محال ہوگا۔''

امام صاحب نے پہلی بار اپنی محبت کا ایسے کھل کر اظہار کیا۔ اس نے صدیوں بعد ملنے والے اپنے باپ کو

دیکھا..... دیکھا اور نظریں بدل لیں۔ اس نے جس کسی سے محبت کی وہ اسے چھن گیا۔ جس کسی نے اس سے محبت کی وہ دُور ہو گیا۔ اب وہ اس نئے انسان کا کیا کرے۔ ان سے محبت کرے یا ان کی محبت پر جئیں۔

''میں نے معافی کا پوچھا..... کیا نہ مانگوں؟'' اسے نصیحت سمجھ نہیں آتی تھی۔

گہرا سانس لے کر وہ باہر آئے۔ وہ ان کے پیچھے ہی تھا۔ اپنے لیے وضو کا انتظام کرتی منور بوا نے سر اٹھا کر باپ بیٹے کو آگے پیچھے ساتھ ساتھ دیکھا۔ اطمینان بخش لمحہ تھا۔ ان کا جی خوش ہوا۔ وہ گھر سے باہر نکلے تو وہ پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ روشنی کے ہنڈوے روشن تھے۔ بہشتی گلیوں میں پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے۔ ستارے دکھائی دیتے تھے اور شہر بھی جاگ رہا تھا۔ اتنی صبح یہ اس کی پہلی صبح تھی۔ سروں پر کھانے پینے کے سامان کی ٹوکریاں رکھے کئی مزدور قریب سے سلام کرتے، راستہ دیتے گزرے۔

''شہر بھی اندھیرے میں جاگتے ہیں؟''

''تمہارے گاؤں کی طرح۔'' وہ مسکرائے۔

اگلا موڑ مڑتے ہی آگے پیچھے کئی خالی ڈولیاں آگے پیچھے نکل گئیں۔ کہار پریشان تھے۔ اتنی صبح وہ کس جلدی میں تھے۔ ''اس پہر!'' امام صاحب نے زیر لب دعائے خیر پڑھی۔ پتھریلی زمین پر باپ بیٹے کے قدموں کی چاپ تھی۔ دھوبی کپڑوں کی گٹھڑیاں اٹھائے دریا کی سمت بھاگے پھرتے تھے۔ کھٹ کھٹ کھڈیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ رات بھر کام کرنے والے صبح دم بھی کپڑے بننے میں مصروف تھے۔ شہر کو کتنا کپڑا چاہیے۔ ریشم چاہیے یا سوت۔ شہر والے کتنے خوش پوشاک ہیں۔ حلوائی کا خادم دُکان کے دروازے کھول چکا تھا۔ جمائیاں لیتے ہوئے اپنا بستر سمیٹ رہا تھا۔ ''آنکھ جاگنے سے پہلے پیٹ جاگ جاتا ہے، بھوک بھوک کرتا ہے۔'' سوچ کر وہ ہنس دیا۔ دینا ناتھ سونار کی دکان کے روشندان سے چراغوں کی روشنی جھانک رہی تھی۔ ''عجب! کہ سوناروں کی دکانوں میں رات بھر چراغ جلتے ہیں۔'' دونوں سونا سونا دکان کے قریب سے گزرے۔ سائیس گھوڑوں کی فوج شہر سے باہر دریا کی سمت لے جا رہے تھے۔ آج ان کی صفائی ہوگی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں نے صبح کو بڑی صبح جگا دیا تھا۔

ٹاپ ٹاپ..... بھلے شہر میں گھوڑے اپنی دھن میں چلتے تھے..... شہر کے باسی لگتے تھے۔

وہ شاہی مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اس کی آواز سے رکے۔ گردن گھمائی۔ وہ دور نیچے کھڑا انہیں سوالیہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھے ان کے ساتھ نماز کے لیے آ رہا ہے۔

''ہاں! معافی مانگ لینی چاہیے۔'' گہری سانس کھینچ کر کہا۔

اس نے وہیں سے اپنا رخ بدلا اور شہر کی سمت چلنے لگا۔وہ اسے شہر کے قاعدے کیسے سمجھائیں۔کیا بتائیں اور کیا چھپائیں۔

''آئے ہو تو نماز ہی پڑھتے جاؤ،لوگ کہتے ہیں امام کا بیٹا ہے اور کبھی جماعت میں نہیں دیکھا۔''

وہ ان کی جماعت سے کب کا نکل چکا تھا۔اس وقت سے جب اسے بہن کی گود میں پھینک دیا تھا۔اب باپ بیٹا ملے تو تھے لیکن مسجد کے میناروں کی طرح۔ایک خون.....ایک زمین.....لیکن دُور دُور.....جدا جدا.....ان کے قیام میں بھی پڑاؤ کی کیفیت تھی۔

اپنے قیام میں وہ اسے دُور جاتے دیکھتے رہے۔انہیں ہمیشہ غلط جگہ محبت ہوتی ہے۔اب اس بیٹے سے ہوئی ہے،جو انہیں معاف تو کر سکتا تھا لیکن شاید محبت نہیں۔

معافی.....

اول معافی.....دوم تلافی.....

☆.....☆.....☆

اپنے گھوڑے پر سوار وہ اس کی سواری کے پیچھے جا رہا تھا۔وہ اسی حویلی سے نکلی تھی جس کی وہ کئی دنوں سے پہرے داری کر رہا تھا۔چھت پر بھی گیا تھا۔کتنی دیر تک ٹہلتا رہا تھا،پھر جھانک کر نیچے دیکھا تھا۔دور بہت نیچے کتنی لڑکیاں تھیں.....کتنی عورتیں تھی.....سب ایک جیسی تھیں.....سوچ کا وقفہ.....ہاں سب ایک جیسی ہی تھیں۔خاص کر لڑکیاں.....ان کی ہنسی،آواز،ان کی بات،چال ڈھال.....سب مٹی کے ایک سانچے سے نکلی لگتیں۔اسے یقین تھا کہ اسے وہ شکل یاد ہے،لیکن یہ وہم بھی تھا کہ اگر تین چار لڑکیاں ایک ساتھ سامنے آ گئیں تو وہ شاید ہی اسے پہچان سکے۔

سواری میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔اسے اچانک کچھ یاد آیا۔بہت ضروری یاد آیا۔کچھ دور تک دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔سواری دریا کے کنارے کنارے ٹہلتے پل کے قریب رک گئی۔وہ سواری سے باہر نکلی،پل کی طرف بڑھ گئی۔اتنی دور تک چل کر گئی کہ کوچوان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔آنچل کے نیچے دبائی پوٹلی نکالی اور گھما کر دریا میں پھینک دیا۔دریا نے نذرانہ قبول کیا اور اپنے ساتھ بہا لے جانے لگا۔یہ ان تحائف کی پوٹلی تھی جو اس کے دل سے اتر چکے تھے۔دل سے اترے،پانی میں ڈوب رہے تھے۔محبت کی ناقدری موجوں میں ہچکولے کھانے لگی۔وہ مسکرائی اور پلٹی کہ.....

وہ عین پیچھے کھڑا تھا۔ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی۔شاید معافی کے لیے اسے ہمت کی ضرورت تھی۔وہ ہمت گھوڑے سے لینے میں مضائقہ نہیں تھا۔آخر یہ گھوڑے وغیرہ کس دن کام آئیں گے۔پہلے وہ سہم گئی کہ چوری پکڑی گئی۔گھوڑے والے

کی نظریں اس ورثے پر تھیں جو دریا میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ کیا کسی کا سر قلم کر کے لپیٹ کر بہا دیا گیا ہے۔

کسی کا دل.....

''عجب! تو یہ بات ہے۔'' اسے لگا وہ واقعی میں اس کی چوری پکڑنے آیا تھا۔

وہ سوالیہ اسے دیکھنے لگا کہ کیا بات ہے۔

''تم وہ پتنگ چور ہو؟'' پہچان وہ گئی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا ہے، ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اسے جواب دینے سے پہلے گردن گھما کر اس کی سواری کو دیکھا، پھر واپس اسے۔ دن کی روشنی میں وہ زیادہ خطرناک لگ رہی تھی۔

''تم وہی ہو جو اپنے گھوڑوں اور کوچوان کو مروا دینے والی تھی۔''

''کیا ہانک رہے ہو..... چور کو چور کہا تو بھڑک اٹھے.....''

''تمہارا کوچوان مر جاتا..... تمہیں منظور تھا.....'' پتنگ چور اسے قاتل ثابت کرنے والا ہے۔

''ہاں منظور تھا۔'' اس کی پیشانی کا زخم دیکھ کر اسے سب یاد آ گیا۔ اس سے ملاقات کا انعام ''زخم'' تو ملنا ہی تھا۔ ''تمہیں تو ہار کی نشانی بھی مل گئی۔'' تمسخر سے پیشانی کے زخم کی طرف اشارہ کیا۔ اس دن یہ گھڑسوار شیر بنا ہوا تھا۔

وہ حیران ہوا۔ ''ہار.....؟ میرا گھوڑا پل پر پہلے چڑھا تھا تمہاری سواری بعد میں برابر آئی تھی۔ تمہیں کوچوان نے نہیں بتایا کہ اگر میں اپنے گھوڑے سمیت پل سے نہ گرتا تو تمہاری گاڑی الٹ کر دریا میں گر جاتی..... گھوڑے زخمی ہوتے اور تم مر جاتی.....''

اور تم مر جاتی..... تم مر جاتی.....

''میں مر جاتی.....؟'' آواز چیخ گئی۔ کیسے منہ بھر کر کہہ دیا۔

''ہاں.....'' سچائی سے بتایا۔ شرافت سے جتایا۔ اس کی موت منہ پر دے ماری۔

''ہارنے والے ہار کی دلیلیں گھڑ ہی لیتے ہیں۔'' طیش سے اس کی سانس پھول گئی۔

''اور مہربانی جھٹلانے والا ناشکری کی.....'' اسے ہنسی آئی۔

اماں نے ناقدری کہا، اس نے ناشکری۔ ناقدری، ناشکری کے لقب پر سامنے والے کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے دریا میں پھینک دینا چاہتی ہے۔ ڈوب جائے یہ۔ مر جائے یہ۔

''آمین.....'' کہنا زیر لب تھا پر زبان سے پھسل گیا۔

''آمین؟'' وہ ناسمجھی سے دیکھنے لگا۔

''اس دن ہماری پتنگ پر تو بہت ہاہا کار مچا رکھی تھی اب میرا پیچھا کرر ہے ہو اس چوری کا کیا۔ آوارہ ہو، بے شرم ہو، بد تہذیب ہو۔ شرفاء کی بہو بیٹیوں کو تنگ کرتے ہو۔ چاہتے ہو وہ گلی گلی بدنام ہوں، ان کی طرف انگلیاں اٹھیں۔''

شرفاء کی بیٹی کی تقریر پر وہ سٹپٹا گیا۔ وہ ابھی تک اس کی پتنگ کو ''ہماری'' پتنگ کہہ رہی تھی۔ وہ اپنا حق چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''اوہ! میں معافی مانگنے ہی آیا تھا۔''

''خوب..... کیسے؟'' بے اختیار مسکرانا چاہا لیکن ضبط کرنا بھی ضروری تھا۔

''ابا جی نے بھی کہا کہ ایسی رسوا کن باتیں نہیں کرتے معافی مانگ لینی چاہیے۔''

''ابا جی سمجھدار لگتے ہیں۔'' وہ ہونٹوں کو خم دے کر ہنس دی۔ آنکھوں میں جو کاجل کھینچا تھا وہ اتھل پتھل ہوا۔

''معافی کی بات بھی ہو جائے گی..... پہلے یہ بولو کون ہوں میں؟'' وہی اپنی شان میں چھوٹا موٹا قصیدہ سننے کی چاہت کہ میں قلعے جیسی حویلی میں رہتی ہے عام تو نہیں ہو سکتی۔ وہ خاموش رہا۔ عجیب سوال تھا۔ وہ لڑکی ہے جیسی سب لڑکیاں ہوتی ہیں۔

''میرے بھائیوں کو جانتے ہو؟'' اپنے بارے میں خاموشی ملی تو بھائیوں پر بات لانی پڑی۔

''وہ کون ہیں؟''

وہ بھنا گئی..... ''تم کچھ نہیں جانتے.....''

''تم بتا دو.....'' معصومیت۔

''میں تمہاری خادمہ ہوں۔'' جھنجھلاہٹ۔

''عجب! ابا جی نے بتایا ہی نہیں کہ تم میری خادمہ ہو..... بتاؤ میری خادمہ کون ہو تم۔''

اس نے ہماری کہا تھا اس نے میری کہہ دیا۔ حساب برابر رہا تھا لیکن.....

ایک بہت بڑی چیل چراغ کے سر پر سے شور کرتی گزری جیسے اسے اچک لے جائے گی۔ ہلکی سی چیخ مار کر سر جھکایا۔ خود کو حملے سے بچایا۔ اف! سب گستاخی کرر ہے تھے۔ وہ چپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بے ساختہ مسکراہٹ آ کر غائب ہو گئی۔ ابھی وہ ملکہ بنی باتیں بنا رہی تھی اب ایک چیل سے ڈر کر چیخ مار رہی تھی۔

''میرے بھائی تمہیں جوتے کی نوک سے مسل دیں گے۔'' دیکھیں کہ ملکہ عالیہ باز ہی نہیں آتی ہیں۔

''یہ بتانا تھا؟'' ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ گستاخ..... گستاخی.....

''ہاں! بولو منظور ہے؟''

منظور ہے..... منظور ہے..... منظور ہے.....

''منظور ہے؟'' اس منظور کی اسے سمجھ نہیں آئی۔ لگتا تھا سامنے والی کا دماغ بہک گیا ہے۔

''تم اس شہر کے نہیں لگتے ورنہ ڈر جاتے۔''

''شہر کے لوگ ڈرتے ہیں، ڈرپوک ہیں..... تم بھی ڈرتی ہو..... افسوس!''

''غضب..... عجب..... اف.....'' اس نے ہونٹ کو دانت سے مسلا۔ ''تم نے اس شہر اور شہر والوں کو کیا سمجھا ہے آخر! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کسی اور ہی زعم میں ہو۔ مجھے کمتر ثابت کرنے پر تلے ہو۔ تم کس شہر سے ہو جو ایسے اترا رہے ہو۔''

''اب میں بھی اسی شہر سے ہوں۔'' وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تعجب! بولو پھر تمہارے اس شہر کے کتنے دروازے ہیں؟'' وہ دو بدو جنگ پر اتر آئی۔

''بارہ..... یا شاید تیرہ.....''

''ایک بولو.....''

''ایک.....''

''ایک بات بولو.....''

''بارہ.....''

''غلط..... اس شہر کے تیرہ دروازے ہیں..... تیرہواں دروازہ بوجھو کون سا ہے.....''

''لکڑی کا.....'' بوجھ لیا۔

''پانی کا تو ہونے سے رہا.....''

''بادشاہوں کا شہر ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''بادشاہوں کو درمیان میں مت لاؤ! لاہور کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔'' لاہور سے اس کا مطلب خود سے تھا۔

''لیکن لاہور کو صدمہ پہنچایا جا سکتا ہے۔'' آخر اس سے اس کا کیا مطلب تھا۔ جسے کہہ کر وہ زیر لب مسکرایا بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے فتح مندی سے گھور رہی تھی کہ یہ شہر تمہارا نہیں نکلا۔ ''یہ ایک پراسرار شہر ہے۔'' اسے لاجواب کرنا

چاہا۔

''تم ایسے بات کر رہی ہو جیسے تم یہ شہر مجھے بیچنا چاہتی ہو۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔

''شہر خریدنے کی تمہاری اوقات ہے؟؟'' ہونٹ طنزیہ سکیڑ لیے۔

''بہتر..... دام بولو.....''

''یہ شہر دام پر نہیں بکتا یہ تو جاں دے کر خریدا گیا ہے۔''

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم جاں دارایم و جنت دیگر خریدہ ایم (ملکہ نور جہاں)

(لاہور کو اپنی جان دے کر خرید لیا ہے۔ یوں کہیں کہ جان دی ہے اور دوسری جنت لی ہے۔)

یوں کہیں کہ جان دی ہے.....

☆.....☆.....☆

جان سے گزر جانے والے بازی گر نے سینے میں موجود دل کو غیر موجود پایا.....

دل کی پہلی غیر حاضری..... دل کی پہلی بے ایمانی.....

خطاء ہے.....

یوں کہیں کہ جان دی ہے.....

جان..... جان.....

☆.....☆.....☆

تیرہ دروازوں کے شہر سے دُور..... پل کے کنارے کھڑی وہ.....

جان دے کر خریدے گئے شہر سے انجان..... اس کے سامنے کھڑا وہ.....

''تیرہواں دروازہ قید کا دروازہ ہے، جو ایک بار اس شہر میں داخل ہو جاتا ہے وہ اس کا اسیر ہو جاتا ہے۔'' کتنا شوق تھا اسے متاثر کرنے کا۔ زیر کرنے کا۔ زیر عتاب رکھنے کا۔

''تو تم ایک قیدی ہو۔'' وہ دوسری ہی منطق نکال لایا۔

وہ بھنا گئی۔ ''میں کیوں قیدی ہوں گی میں تو شہزادی ہوں۔''

شہزادے کی نظر شہزادی کے پیروں پر پڑی۔ جس سے اس کی ہتھیلی مسلی تھی اس پاؤں کے انگوٹھے پر مرہم لگا تھا۔ اسے چوٹ پہنچا کر وہ خود بھی چوٹ کھا چکی تھی۔ اچھا تو حساب برابر ہو گیا۔ زیر لب ہنسا۔

حساب برابر ہو جانے والا ہے۔اس کی مسکراہٹ دیکھ کر پیشانی پر تیوری پڑ گئیں۔ ''تمہیں معافی چاہیے تھی۔ایسے سر راہ معافی نہیں مل سکتی۔میری بے عزتی کی،میرے دل کو تکلیف پہنچائی.....شالامار باغ جانتے ہو؟''

''نہیں!ابا جی سے پوچھ لوں گا۔''

وہ ہنسی۔''چاہو تو سارے شہر سے پوچھ لینا.....دن ڈھلے وہاں آجانا.....''

''شام کو؟''

''دن ڈھلنے کو نہیں سمجھتے۔''وہ کتنا چڑتی تھی۔

''جان چکا ہوں.....خدا حافظ.....''پشت گھمالی۔قدم بڑھا لیے کہ آواز سے رکا۔

''قلعے کو جانتے ہو.....وہ وہاں اس طرف دیکھو.....بلند فصیل دکھائی دیتی ہے نا.....وہ وہاں.....''

اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جیسے کہتی ہو دیکھو وہ بلبل.....وہ فاختہ.....وہ.....وہ.....اس نے پہلے بلبل کو دیکھا پھر بلبل کے ہاتھ کے اشارے کی طرف۔اس طرف ابا جی کی مسجد کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔کیا وہ مسجد کو ہی قلعہ کہہ رہی ہے۔

''وہ ابا جی کی مسجد ہے.....وہاں آؤں.....تم بھی وہاں آؤ گی؟''وہ حیران ہوا۔

''وہ مسجد جہانگیر کی ہے تمہارے ابا جہانگیر ہیں پھر تو تم خسرو ہوئے؟''

''ابا جی اس مسجد کے امام ہیں۔''خسرو بے چارے کو وضاحت دینی پڑی۔

''ایسے کہو.....تم پوری مسجد ہی اپنے نام لگا رہے تھے۔''

''مسجد تعمیر کرنے والوں کی نہیں آباد کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔''اس نے پہلی بار باپ کی حمایت کی۔

''معافی مانگتے ہو اور زبان درازی سے باز نہیں آتے۔کیا یہی تمہارا قاعدہ ہے۔دیہاتیوں کو یہ خاص بیماری ہوتی ہے اپنی سادگی کو نیکی اور شہریوں کی عقل کو گناہ کہتے ہیں۔''

''کیا یہی تمہارا قاعدہ ہے!!''بے قاعدہ اس جملے کو سمجھ نہیں سکا۔

''تمہارے ابا جی جہانگیر کی مسجد کے سامنے قلعہ ہے جلال الدین اکبر کا.....وہاں آجانا.....''اس نے''تمہارے ابا جی''کو خوب اچھی طرح سے چبایا۔''تم یہاں نئے ہو تو بتا دوں کہ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔پہرے دار پہرہ دیتے ہیں۔مجھے وہاں سب جانتے ہیں لیکن تمہیں چھپ کر جانا ہوگا۔''

''میں کس سے اجازت لے کر جاؤں؟''

''ہماری حویلی اجازت لے کر آئے تھے۔''

''وہاں میں اپنی پتنگ لینے آیا تھا۔''

''قلعے میں بھی اپنی معافی لینے جاؤ گے برا کیا ہے۔'' اب وہ مشورہ دے رہی تھی۔

''شام سے پہلے آنا میں شیش محل میں ہوں گی۔''

''شیش محل؟''

وہ زچ ہوگئی۔ ''یہ محل دریا کے رخ پر ہے۔ میں وہیں جھروکے میں کھڑی ہوں گی۔'' وہ اس کے لیے کتنے اچھے اچھے کام کرنے والی تھی۔

''جھروکے؟'' وہ شہر کی پوری زبان نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے زچ ہو کر دونوں ہاتھوں سے جھروکے بنایا۔ ''ایسا ہوتا ہے..... میں اس میں کھڑی ہوں گی.....''

''کھڑکی میں؟''

''کھڑکی وہ ہوتی ہے جو بند ہو جائے، جھروکے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جو خوبصورت مناظر کی طرف بنتے ہیں۔ دریا کے رخ پر بنا ہوا ہے۔'' وہ چلا اٹھی۔

وہ سمجھا تو ابھی بھی نہیں تھا لیکن ہاتھوں کے اشارے سے اس نے جو جھروکا بنایا تھا وہ کمال تھا۔

''میں نہ ملوں تو آواز دے کر ڈھونڈ لینا پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں۔'' کتنی اچھی ہے وہ۔

''میرا قلعے میں آنا کیوں ضروری ہے۔'' وہ کچھ مخمصے میں تھا۔

''کوئی ڈر ہے.....''

ڈر تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ سوچ رہا تھا قلعے میں جا کر لڑکی کو آواز دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔

''مجھے آواز دینا اچھا نہیں لگے گا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں..... بے شک سارے شہر میں دیتے پھرنا۔'' وہ اسے دیوانگی کا عندیہ دے رہی تھی۔

سارا شہر اس کے ساتھ چراغ چراغ کرے گا لیکن ابھی نہیں.....

''سر عام معافی تلافی نہیں ہو سکتی اب میں جا رہی ہوں۔'' یعنی تخلیہ!

''نام کیا ہے تمہارا؟'' جاتے جاتے رک گئی۔ پلٹ کر پوچھا۔

''شمس امیری.....''

"تم باپ بھی چراتے ہواور نام بھی..... شمس چرالیا تھاتو تبریز بھی چرالیتے..... چور....."

پتنگ چور..... نام چور..... اور..... اور.....

پائیدان پر پیر رکھ کرسواری پر سوار ہوگئی۔ دروازہ بند کرلیا۔ اپنے گھوڑے کے ساتھ وہ پل پر ہی کھڑا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گردن گھما کراس کی طرف دیکھا۔ وہ بہتے ہوئے دریا کا نظارہ کررہا تھا۔

"آخری بار یہ دریا دیکھ لوامیری..... شمیری..... فقیری....."

☆.....☆.....☆

امیری اسی راستے سے گیا جواسے سمجھایا گیا تھا۔ دریا میں چھلانگ لگا کر، قلعے کے پہرے داروں سے نظر بچا کر۔ وہ قلعہ سر کر چکا تھا۔ اندر داخل ہو چکا تھا۔ شیش محل کہاں ہے قلعے کے دو چکر لگانے پر بھی اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اسے کئی جھروکے دکھائی دیے۔ سمجھ نہیں آیا کون سا والا شیش محل کا ہے۔ وہ کھیتوں کھلیانوں میدانوں میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ اسے پتھروں سے بنی عمارتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ تو یہ تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ شہر کے لوگ اتنے بڑے بڑے گھر کیوں بنواتے ہیں۔ اسے ابا جی کا گھر بھی قلعے جیسا لگتا تھا۔ "کسی بادشاہ کا دماغ چل گیا تھا جو زمین کے سینے پر قلعے جتنا بوجھ لاد دیا تھا۔" قلعے میں گم ہو ہو جاتے اس نے سوچا تھا۔ وہ شام سے پہلے آیا تھا۔ شام ٹھہر جانے پر بھی اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ اب روشنی کا انتظام ہو رہا تھا۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا لیکن کیسے دے۔ اس سے نام تو پوچھا ہی نہیں تھا۔ نام جان بھی لیتا تو پھوپھی کہا کرتی تھیں کہ لڑکیوں کے نام کی صدا نہیں لگاتے۔ مجبوراً دونوں ہاتھوں سے زور دار تالی بجانی پڑی۔ آواز کی گونج اٹھی۔ اس نے چار اطراف دیکھا۔ وہ شاہی میں کھڑا تھا۔ وہاں اوپر جہانگیر بیٹھا کرتا تھا، اور نیچے درباری موجود ہوتے تھے۔ جہانگیر کا دربار..... دیکھیں کہ وہ اس کے دربار میں کیسے گستاخی کررہا تھا۔

حداد ب شمس امیری!

"شمس امیری حاضر ہے جناب عالی....."

اس نے شاہی زبان میں ہی آواز لگائی۔ آواز گونجی۔ وہ مسکرادیا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح کھیل رہا تھا۔

شمس امیری..... شمس فقیری.....

وہ اپنا ہی نام لیتا جاتا اور قلعے میں بھاگتا پھرتا۔ جہانگیر کی شاہی مستند میں جا کھڑا ہوا، وہاں سے چلایا۔ سامنے سارا باغ اُس کی نظر میں سمٹ آیا۔ وہیں سے چھلانگ لگا کر کود گیا۔ سیڑھیاں پھلانگتا باغ میں نکل گیا۔ اور پھر "امیری امیری" کے نام کی گونج جہانگیر کی خواب گاہ میں گونجنے لگی۔ اس کے کتب خانے میں..... اور پھر یہ گونج ہاتھیوں کے ساتھ سیڑھیاں

پھلانگنے لگی..... شیش محل کے جھروکوں سے ٹکرا کر، جعفریوں سے جھانک کر، دالان میں بھاگ کر، قلعے کی سیڑھیاں چڑھتے، پھلانگتے، دھوبی گھاٹ کو پار کرتے، پائیں باغ سے گزر کر، واپس جہانگیر کے دربار میں جا ٹھہری.....

''شمس امیری حاضر ہے۔''شہزادہ دربار میں کھڑا ہو کر چلایا۔

''عالم پناہ ہم بھی حاضر ہیں۔''

شہزادے کا درباری، اپنا موٹا ڈانڈ الہرا کر اسے بتا رہا تھا۔ تین چار اور پہرے دار اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ جیسے وہ شیش محل کی شہزادی ڈھونڈتا پھر رہا تھا، ویسے ہی وہ عالم پناہ کی تلاش میں تھے۔ اسے وہاں بلانے والی تو نہیں ملی تھی پہرے داروں کے پتھریلے ہاتھوں کی گرفت مل گئی تھی۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے اس تہہ خانے میں لے گئے جہاں کبھی بادشاہ بھوکے شیر باندھا کرتے تھے۔

شام بیت چکی.....

رات گہری ہو چکی.....

☆.....☆.....☆

امام صاحب اس کی گھر واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ عشاء کے بعد بھی نہیں آیا تو وہ اسے ڈھونڈنے نکلے۔ رات آنکھوں میں کٹی، شہر کی گلیوں میں اس کا نام لیتے پھرے۔ وہ امام صاحب کا بیٹا ہے ابھی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ جس سے شمس کا پوچھتے، اسے اس کی شکل وصورت حلیہ بھی بتاتے، اور پھر رو دیتے۔ کامل دل وہمی ہوا۔ شامل رات حقیقت ہوئی۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ لوگوں نے ان کی سسکیاں سنیں۔ وہی جو مرحومہ بیوی کو قبر میں اتارتے ہوئے سنی تھیں۔ ان کا وہ سسکنا دیکھا نہیں گیا۔ یہ سسکنا سنا نہیں گیا۔ ایک آدمی گاؤں بھجوایا۔ شام تک وہ بھی لوٹ آیا، وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ تیسرے دن امام صاحب نمازیوں کے سامنے بلک اٹھے۔

''کوئی میرا دل نہ نکال لے گیا ہو۔''

ان کا دل نکال لینے والا تازہ پھول کلیوں سے اپنا دل بہلا رہا ہے۔ پاک دامن کے جہیز کا سلسلہ چاندیوں پر بکھرا ہے۔ سلمے ستارے، زری سے سامان کی تیاریاں ہیں۔ حویلی کی رہنے والیاں، کاریگر عورتوں کے ساتھ مل کر کچھ ٹانکے اپنی خوشی سے لگا رہی ہیں۔ اس مشغولیت میں بھی ان سب کی انگلیوں میں بار بار سوئیاں چبھتی ہیں۔ جیسے سارا شہر پریشان ہے۔ حویلی والیاں بھی اداس ہیں۔ کاریگر عورتیں باہر کی کتنی خبریں لائی ہیں۔

''امام صاحب کی حالت دیکھی نہیں جاتی، پانچ دن سے بیٹا لاپتہ ہے۔ چوک چوبارے ہر طرف امام صاحب کے

دکھ کی دہائی تھی۔"

"گیا کہاں کہ کوئی نشان تک نہیں مل رہا۔" اماں پرانی خبر نئی افواہ کے ساتھ لانے والے سے ہی پوچھ رہی تھیں۔

"ملے گا کیسے..... جب انہوں نے کہہ دیا ہے کہ کوئی قلعے کے آس پاس دکھائی نہ دے پھر کیوں گیا وہاں۔"

سفید چاندنیوں پر بکھر کر بیٹھنے والوں کی گردنیں اس کی سمت گھوم گئیں۔ وہ اکیلی تخت پر بیٹھی تھی۔

"قلعہ..... اس کا قلعے سے کیا لینا دینا۔" اماں فرشی نشست پر بیٹھی تھیں۔

"غضب خطاء ہوئی۔" خود سے کہا۔ زبان کو دانت سے کچلا۔

"میں نے سوچا گاؤں سے آیا ہے شاید شہر دیکھنے....." خطاء پر خطاء۔

"تمہیں کیا خبر کہ وہ گاؤں سے آیا ہے۔" اماں کا رنگ زائل ہوا۔

"سب کہہ رہے ہیں....." زبان بے لگام رہی تھی۔ اب سرپٹ دوڑ رہی تھی، قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

"سارے شہر میں دہائی مچی کہ امام صاحب کا جوان بیٹا لاپتہ ہے، شہر میں نیا ہے۔ یہ نہیں سنا کہ گاؤں سے ہے، تم نے کس سے سن لیا؟" اماں کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ چچی کی آنکھیں وہمی ہوئیں۔ کاریگر عورتوں نے معنی خیز خاموشی اپنا لی۔

"کسی کو کہتے سنا تھا اماں! پھر دیکھنے میں بھی گنوار ہی لگتا ہے۔"

زیادہ زبان چلانے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ جواب دیے بغیر رہ نہیں سکتے۔ نشست گاہ میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سب کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ چھوٹی بھابھی کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔

"گنوار لگتا ہے..... تم نے اسے دیکھا ہے چراغ؟" اب چچی نے پہل کی۔

اب چراغ خاموش!

"تم نے اسے کہاں دیکھا ہے چراغ؟" بے چاری چچی۔

اس نے جھلا کر پھولوں کو پٹخا۔ "چھت پر چوری کرنے آیا تھا میں نے عین وقت پر پکڑ لیا۔"

سکوت.....

"میں نے کتنی آوازیں دیں..... خطاء ہے جو کوئی میری سنتا ہو۔"

چھت پر کیا ہوا سے زیادہ انہیں اس کے ساتھ کیا ہوا کی فکر تھی۔ "وہ کہاں ہے چراغ؟"

چچی نے کس دل سے پوچھا۔ اس نے ایک نظر چچی کو دیکھا جن کا رنگ انجانے خیال سے بدنما ہو رہا تھا۔

"کیا وہ مر چکا ہے چچی!" وہ شوخی سے چچی کے سامنے پھسل کر بیٹھ گئی۔

چچی نے ایک افسوس بھری نظر اس پر ڈالی۔ ''چراغ! تمہیں شرارتوں سے کبھی نہیں روکا، دل کی آہ لینے سے رک جاؤ۔''

اماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان کا دل مٹھی میں کھینچا آتا تھا۔ ''تمہیں قلعے کی کیا خبر؟''

''کوچوان سے اجنبی قلعے کا راستہ پوچھ رہا تھا، خیال آتا ہے کہ شاید وہی تھا۔''

آرام سے اٹھی، پھول سمیٹے اور چلی گئی۔ پیچھے ایسا سناٹا چھوڑ گئی کہ ہر عورت نے جب سوئی اٹھائی تو اپنا خوف سی ڈالا۔

''کہتے ہیں امام صاحب کا حال دیکھا نہیں جاتا۔'' اماں بڑبڑائیں۔

☆ ☆ ☆

چھ دن گزر گئے وہ واپس نہیں آیا۔ اماں کتنی چپ تھیں۔ کوچوان کو بلایا، پوچھا، اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کسی اجنبی نے قلعے کا پوچھا تھا۔ ''کوچوان جھوٹ بولتا ہے، اسی سے پوچھیں۔'' وہ بار بار یہی کہتی رہی۔ کوچوان کو پھر بلایا، یاد دلانا چاہا۔ وہ سچ بول رہا تھا، سب کو سنائی دے رہا ہے۔ جھوٹ وہ بول رہی ہے، سب دیکھ سکتے تھے۔ اماں کا اپنی اولاد پر ہی بس نہیں تھا، کسی سے کیا کہتیں۔ حویلی کے مردوں کو کیا بتاتیں۔ آدھی کہانی بھی سناتیں تو پوری پھنس جاتیں۔ اندر ہی اندر اعتبار کے ملازموں سے معلوم کروانا چاہا لیکن کوئی کوشش بر نہیں آئی۔ اس کا کہیں نشان نہیں ملا۔

وہ کہاں ہے صرف وہی جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ قلعے کے محافظ جلاد ہیں۔ کوئی دیوار پھاند کر قلعے میں آئے وہ اس کی جان نکال لیں گے۔ تہہ خانے میں خاص قیدیوں، دشمن مخبریوں، باغیوں کو رکھا جاتا ہے۔ وہ وہاں پرندے کو پر نہیں مارنے دیتے تھے، انسان کو دیوار کیسے پھلانگنے دیتے۔ کبھی آغائی سے قلعے کے تہہ خانوں کی حقیقت کے بارے میں سنا تھا۔ سوچا اس گنوار کو اس حقیقت سے روشناس کروا دیا جائے۔

مسجد امام صاحب کی آہ سے گونجتی رہی۔ شہر پر ان کے دُکھ کی اداسی چھائی رہی۔ ان جیسے شریف النفس انسان کا حال تمام ہوا۔ دریا تک کی خبر لی گئی کہ کہیں وہ ڈوب نہ گیا ہو۔ جو جہاں جتنا کر سکتا تھا اتنا کر چکا۔ پھر بھی گمان غالب رہا کہ اپنی مرضی سے کہیں جا چکا ہے۔ یا کسی نے قتل کر کے لاش کو چھپا دیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی دشمن بھی نہیں تھا جو اسے مارتا۔

دشمن اپنی سواری میں بیٹھا، قلعے کی چار دیواری کو تمسخر سے دیکھ رہا تھا۔ اسے افسوس تھا نہ فکر۔

''مر ہی چکا ہو......''

مر جانے والا نو دن بعد ظاہر ہوا۔ جمعے کی نماز کے بعد اس کی سلامتی کے لیے اجتماعی دعا ہو رہی تھی۔ سارا شہر آمین کہہ رہا تھا...... انہی آمین کہنے والوں کی صفوں کے پیچھے سے وہ قدم گھسیٹتا ہوا اگلی صفوں کی طرف بڑھا۔ کوئی بلک بلک کر روتے ہوئے دعا کروا رہا تھا۔ دعا گو کی دعا تھی کہ تمام نہ ہوتی تھی۔ درد تھا کہ سمٹتا نہ تھا۔ ''میرا شمس، میرا شمس'' کا ورد ہر ساعت تھا۔

"ابا جی....."

وہ سیڑھیوں سے نیچے کھڑا تھا، وہیں سے پکارا۔ آواز باپ کے کانوں تک تو کیا جاتی کہیں دل کی ساعتوں سے ٹکرائی ہو گی۔ گڑگڑا کر دعا مانگتے امام صاحب کھڑے ہوئے، گھوم کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کے گمان نہیں، دل نے کہا تھا نا۔ اسی لیے بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف آئے۔ جیسے ان کی نظر شمس پر پڑی وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ حوض کے پاس کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ وہ سب چونک کر دیکھنے لگے۔

"میرے شمس....." اس کے بغیر بے دم ہو جانے والا باپ، دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

نمازیوں کا سارا اجتماع "ان کے شمس" کے گرد سمٹ آیا۔

اس قیدی کے گرد جو شہر کے اسیر کر دینے والے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا.....

وہی دروازہ جس سے اندر جائیں تو پھر وہ کہیں اور نہیں جانے دیتا.....

☆ ☆ ☆

"کہاں تھے تم؟"

کئی دن وہ تیز بخار میں نیم بے ہوش رہا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے آہنی پتھروں کی سلوں میں پیس دیا گیا تھا۔ زخم گننے کی ان میں سکت نہیں رہی تھی۔ البتہ اس کے زخموں پر مرہم لگاتے وہ آنسو گرا دیتے تھے۔

"جواب دو میرے شمس....."

ان کے شمس نے نیم وا آنکھوں سے ان کے چہرے پر کندکرب کو دیکھا۔ کتنا دکھی انسان ہے یہ۔ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو سمیٹ لینے کی چاہت ہوئی۔ "میں ٹھیک ہوں۔" تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تمہارا باپ ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ پیدا ہوا تھا تو ان کی قمر چلی گئی۔ قمر کیا گئی، انہوں نے اس نئے چاند سے ہی منہ موڑ لیا۔ بے اولاد بہن کی گود میں پھینک دیا۔ گھر کی عورت نہیں گئی تھی، ان کے دل کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ وہ ان کی شریک حیات نہیں ان کا جہاں تھی۔ وہ خالق سے ایسے منسوب ہوئے کہ ان کی پرہیز گاری چار عالم مشہور ہو گئی۔ ان کی درویشی میں ایک ہی کھوٹ رہ گیا تھا کہ انہوں نے پلٹ کر کبھی بیٹے کی خبر نہ لی۔

وہ تیرہ سال کا تھا جب دونوں پہلی بار ملے تھے۔ بہن بیمار تھی، کئی خط لکھے۔ پیغام پر پیغام بھجوائے کہ ایک بار مل جاؤ۔ ایک دن اچانک ملنے چل پڑے۔ گاؤں سے ذرا دور ایک ساتھی سنگ آئے تھے۔ وہ اپنی سواری پر آگے نکل گیا یہ گاؤں

کی سمت چلنے لگے۔ جیسے کسی ضد میں تھے۔ آنا نہیں چاہتے تھے۔ گاؤں ابھی دُور ہی تھا کہ چلتے چلتے رک کر درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ پیاس کی شدت اور تھکاوٹ نے انہیں نیم جان سا کر دیا تھا۔ جسم سے زیادہ دل تھکا ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ بہن بیٹے کی بابت ہی کچھ کہنا سننا چاہتی ہو گی۔ اور انہیں بیٹے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نیند تھی یا بے ہوشی کہ پانی کے چھینٹوں سے ہوش میں آئے۔ دیکھا کوئی ان پر جھکا ان کے گال تھپک رہا ہے۔

''سفر کی ہمت نہ ہو تو مسافر نہیں بنتے۔'' ان کے منہ سے پانی لگانے والا تند لہجے میں جتا رہا تھا۔

'' گاؤں میں میری بہن جمیلہ رہتی ہے، اسے پیغام بھجوا دو کہ کوئی سواری بھجوا دے۔''

''ان کے گھر کوئی سواری نہیں ہے۔''

کرختگی سے کہا اور ان سے پشت پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ پھر چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ وہ آوازیں ہی دیتے رہ گئے لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

'' گاؤں کا خون کتنا بدلحاظ ہو چکا ہے۔''

بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور ہمت کر کے چلنے لگے۔ کچھ وقت گزرا، وہ گھوڑے کی لگام تھامے آتا ہوا دکھائی دیا۔ چپ چاپ ان کے سامنے گھوڑا کھڑا کر دیا۔ سہارا دے کر بٹھایا اور باگ پکڑ کر چلنے لگا۔ وہ اس سے گاؤں کا احوال پوچھتے رہے۔ وہ خاموش رہا۔ انہیں بھی خاموش ہونا پڑا۔

'' بیٹے نے باپ کی باگ سنبھال ہی لی، جمیلہ بہن کا ارمان پورا ہو گیا۔''

چوپال میں بیٹھے مردان کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے حیرت سے باگ تھامے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی تندی، اس کی پیشانی کے بل، اس کی غصیلی چال..... وہ اس کی پشت گھورتے رہ گئے۔ جی چاہا گھوڑے سے کود کر اسے سینے سے لگا لیں۔ یہ خواہش بھی ہوئی کہ گھوڑے کو ایڑ لگائیں اور اس سے دور ہو جائیں۔ وہ دنیا داری ہی نہیں، اپنا دل بھی سمیٹ چکے ہیں۔ اب اس نئی محبت کو کہاں رکھیں گے۔ اس اولاد کا کیا کریں گے جس کا سینہ باپ کی شفقت کی محرومی سے چھلنی تھا۔

''تم نے مجھے پہچانا کیسے؟'' انہیں یقین تھا کہ وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ اسی لیے تند لہجے میں بات کرتا رہا تھا۔

''آپ کی درویشی پر پھیلی بے اعتنائی سے۔''

ان کے دل تک سناٹا پھیل گیا۔ باپ بیٹے کی پہلی ملاقات تند لہجے اور خاموشی کے سوا کچھ نہ تھی۔ بہن چاہتی تھی کہ باپ بیٹا ساتھ رہیں۔ وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے، وہ ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ چند سالوں بعد بستر مرگ پر پھوپھی اس کا

ہاتھ چومتی تھی اور منت کرتی تھی۔

''میرے بھائی کو معاف کر دو امیری! وہ تمہاری ماں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے جب محبت کی، بدلے میں جدائی پائی..... ہماری ماں سے جدائی، تمہاری ماں سے جدائی..... وہ تم سے جدا ہونے سے بھی ڈرتا ہے..... اپنے باپ کے پاس لوٹ جانا.....''

وہ باپ کے پاس لوٹ آیا..... اور معافی..... ماں باپ مر جائیں تو صبر آ جاتا ہے۔ باپ زندہ ہو اور خبر نہ لیتا ہو، صبر آتا ہے نہ قرار۔ بیوی سے محبت کی انتہا تھی اور بیٹے سے بے اعتنائی کی۔ وہ جوان ہو چکا تھا، اسے دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا۔ بہن نے ساری محبت نچھاور کر دی تھی۔ وہ بدلحاظ اور بے نیاز لگتا تھا۔ ماں کو دیکھا نہیں تھا۔ باپ سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے اس بات پر کیا فخر ہو گا کہ اس کا باپ شاہی مسجد کا امام ہے۔ سارا شہر ان کے آگے چلنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ جان چکے تھے کہ وہ تھوڑا ضدی ہے۔ شاید پھوپھی کے لاڈ نے بگاڑ دیا ہے۔ وہ اسے مسجد لے گئے تو اس نے مسجد کے وسیع احاطے میں کھڑے ہو کر کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔

''آپ کے یہاں کا آسمان بہت بڑا ہے۔''

''گاؤں میں آسمان نہیں ہوتا۔'' اس کے طنز پر بھی وہ ہنس دیے۔

''ہوتا ہے..... گنوار آسمان..... دیہاتی ستارے..... گاؤں والوں کی طرح ان کی ہستی بھی معمولی رہتی ہے۔''

بیٹے کی بات ان کے دل پر زخم چھوڑ گئی۔ مسجد کی وسعت پر شرمندہ ہوئے۔ اتنی بڑی مسجد کا امام اور دل کا ایسا تنگ۔ ساری دنیا کو دین سکھاتے رہے، خود باپ کے فرائض بھول گئے۔ جو خونی رشتے نہ نبھا سکے، وہ خدائی رشتہ کیا نبھائے گا۔

''کہاں تھے تم.....'' کتنی بار پوچھ چکے تھے۔

''غلطی سے کسی نے قید کر لیا تھا۔''

''کس نے..... اسے سزا ملنی چاہیے..... نام لو اس کا.....''

''اتنے دن نام ہی لیتا رہا ہوں.....''

سارا قلعہ گونجتا رہا..... تہہ خانہ..... قید خانہ.....

نام ہی تو لیتا رہا.....

☆ ☆ ☆

مسجد میں اجتماعی دعا کے بعد سے سارا شہر اسے جان چکا تھا۔ اس کا لاپتہ ہونا صدمہ تھا۔ اس کی واپسی خوشخبری۔ جنگل

کی آگ کی طرح خبر سارے شہر میں پھیلی چکی تھی کہ وہ لوٹ آیا ہے۔امام صاحب سے قربت رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔کئی گھروں میں خصوصی دعائیں کروائی گئی تھیں۔مسجد میں قرآنی قاعدے پڑھنے والے بچوں کو یہ نام ازبر ہو چکا تھا۔جس شہر سے شمس ناواقف تھا،وہ شہر اس سے واقف ہوگیا۔وہ گھر گھر کی بات ہوا۔کہ واپس آچکا ہے لیکن بتاتا نہیں کہاں تھا۔آخری دموں سے واپس آیا ہے۔کسی ظالم نے جان نکال کر جان بخشی ہے۔

''شکر اللہ کا.....''چچی نے خبر سنتے ہی کہا تھا۔

''کیوں چچی آپ کا رشتے دار ہے جو شکر ادا کر رہی ہیں۔''وہ جل بھن گئی۔

''انسانیت کا رشتہ ہے چراغ!''

''حویلی میں انسانوں کی کمی ہے کہ آپ باہر والوں سے رشتے بنائیں گی۔''وہ بڑبڑانے لگی۔

اس باہر والے کے لیے حویلی کے اندر والے اس سے خائف تھے۔رہ رہ کر چراغ پر غصہ آیا تھا۔انہیں چراغ پر دو کوڑی کا یقین نہیں آیا تھا۔حویلی کی ہوا بدلی ہوئی تھی۔کفایت تک کا مزاج برہم تھا۔یعنی اب نوکر چاکر بھی مزاج دکھا رہے تھے۔اماں اس کی طرف دیکھنے تک سے نالاں تھیں۔

''اگر ایسا کچھ ہوا بھی ہے تو اولاد کو سات خون معاف ہوتے ہیں۔''وہ اماں کو منانے کی کوشش کرنے لگی۔

''جس اولاد کو سات خون معاف ہوتے ہیں،اس اولاد کے ہاتھوں پہلا قتل ماں کا ہی ہوتا ہے۔''

وہ لاجواب ہوئی۔''میرا یقین کریں!مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔''

اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ قلعے کے تہہ خانوں میں کیا ہوا ہوگا۔وہاں کوئی زندہ شیر تھا.....تھا تو پھر قیدی کو اس کے سامنے کیوں نہیں پھینکا گیا۔

زندہ شیر کے پنجوں سے آزاد ہو چکا شیر دل کئی دن گزرے چھتیں پھلانگتا،منڈیریں فتح کرتا حویلی کی چھت پر آیا۔آج کل اس کا موروں سے لگاؤ چل رہا تھا۔وہ ان کی ناز برداریاں کر رہی تھی،جیسے ہی وہ چھت پر کودا،مور تو مور،وہ تک اپنی چال بھول گئی۔مور بے ہنگام ناچنے لگے۔سب کے پر پھیل گئے۔مہریوں سمیت کوئی دس بارہ لڑکیاں موجود تھیں۔اسے کودتے دیکھ کر سب کی چیخیں نکل گئیں۔

''تو تم زندہ ہو.....واہ.....کمال.....کیوں آئے ہو؟''پہلے چونکی،پھر اس کی طرف بڑھی۔

''معافی کے لیے.....''

''معاف کیا.....''

''معافی مانگو مجھ سے.....''

اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔''پہلے سبق سے سبق نہیں سیکھا۔''اس نے کن اکھیوں سے حور کی طرف دیکھا کہ وہ سنتی تو نہیں۔

''سیکھ کر ہی آیا ہوں.....وہاں مانگنے گیا تھا..... یہاں لینے آیا ہوں.....''

''ورنہ؟''

اس نے ورنہ کا نہیں سوچا تھا۔''ورنہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''بے سوچے کہا۔

کفایت چند قدم آگے بڑھنے کی ہمت کر چکی تھی، کان لگا کر سن رہی تھی۔اتنا سن کر منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ دبائی۔

''مجھے ڈر لار ہے ہو۔''وہ کچھ ڈر تو گئی تھی۔

''تمہیں بتا رہا ہوں.....''جیسا کہ وہ لیے بغیر نہیں جایا کرتا۔

''وہاں سے زندہ نکل آئے ہو یہاں سے نہیں نکل پاؤ گے۔''قیدی کو کڑی نظروں سے جانچا۔

''منظور ہے.....''

پچھلی بار اسی نے پوچھا تھا''بولو منظور ہے''۔اب وہ بتا رہا تھا تو یہ سہم رہی تھی۔

''دیوانے ہو..... جان عزیز نہیں ہے.....''وہی ادھر ادھر کی بے تکی باتیں۔

''جان عزیز نہیں.....''وہی بنا سوچے سمجھے ضدی باتیں۔

وہ ٹھٹکی۔سر گھما کر لڑکیوں کے ہجوم کی طرف دیکھا۔ان سب کو کتنا اشتیاق تھا کہ وہ امام صاحب کے اس بیٹے کو دیکھیں جس کی اتنی دھوم مچی ہے۔اب وہ اسے دیکھ رہی تھیں اور جان چکی تھیں کہ سب کا شک درست نکلا چراغ ہی امام صاحب کی سسکیوں کی مجرم نکلی۔

''بہتر! یہیں کھڑے رہنا.....''لفظوں کو چبایا۔

''منظور ہے.....''وہ دو بار منظور ہے کہہ چکا تھا۔

''مردوں کو آ لینے دو پھر کہنا منظور ہے.....''

''منظور ہے.....''تیسری بار بھی کہہ دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ پلٹی تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔چال لڑکھڑا گئی۔لڑکیاں اس سے پہلے نیچے بھاگیں۔دُور نیچے جنگل میں

آگ بھڑکی۔ باغ کی کانٹ چھانٹ کرتیں خاکروب اس تہلکہ خیزی پر پریشان ہوئیں۔ یہ جلوس سیڑھیاں پھلانگتا، دالانوں سے بھاگتا، کمروں میں جھانکتا اماں بی کو ڈھونڈتا احاطے میں آیا۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ چراغ کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑیں چچی کا جی بیٹھ گیا۔ بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا۔

''چراغ یہ کیا کہہ رہی ہیں.....؟'' اماں کا رنگ فق تھا۔

جب تک وہ خراماں خراماں چلتی اپنے جھولے پر آ کر بیٹھی، سب کچھ بیان کیا جا چکا تھا۔

''انہی سے پوچھ لیں ورنہ اوپر جا کر دیکھ لیں۔'' اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

''چراغ.....'' اماں کی آواز لرز رہی تھی۔

چچی کے پیچھے باقی سب بھی آ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ فکرمندوں کا جلوس اس کے گرد جمع تھا۔

''اس بار کون سی قیامت برپا کی ہے چراغ!'' اماں کی آواز دل کی طرح بیٹھی جا رہی تھی۔

وہ سہم گئی۔ ڈر گئی۔ اور ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مر جاتی ہوں میں..... دفن ہو جاتی ہوں میں..... میں اپنی بے عزتی نہیں سہہ سکتی.....''

اس کا رونا اتنا اچانک تھا کہ اماں نے الجھ کر چچی کی طرف دیکھا۔

''ہوا کیا کچھ معلوم ہو۔'' بھابھی قریب بیٹھ کر دلاسہ دینے لگیں۔

''وہ اُوپر کھڑا ہے، جاتا ہے تو بھیج دیں۔'' رونا بھی اور ہچکیاں بھی۔

چچی نے قریب آ کر اس کا سر سہلایا۔ سب اس پر آگ بگولہ ہونے آئی تھیں، اب الٹا پچکار رہی تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ یہ ہیں حویلی کے قاعدے! پھر سے چراغ کے دام میں آ گئے۔

چراغ کے دام..... چراغ کے جال.....

کفایت کو بٹھایا، سمجھایا، اوپر بھیجا کہ جاؤ معاملہ نپٹاؤ۔ وہ گئی اور واپس بھی آ گئی۔

''وہ کوئی جواب نہیں دے رہا..... نہ معلوم سنتا بھی ہے یا نہیں.....''

وہ چراغ کی سن سکتا ہے تو ان کی بھی سن سکتا ہے۔ پھر کفایت کو بھیجا۔ کفایت نے اسے ڈرایا، سمجھایا، درخواستیں بھی کیں۔ امام صاحب کا ذکر بھی آیا۔ حویلی کے مردوں سے ڈرایا۔ کچھ قاعدے، قانون یاد دلائے۔ لیکن اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔ بات مردوں کو نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ مرد ملازموں سے مدد نہیں لی جا سکتی تھی۔ پھر کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ امام صاحب کا بیٹا تھا، بات حویلی سے نکلتی اور پھر کبھی ہاتھ نہ آتی۔ اماں نے اوپر جانے کی ہمت کی۔ سیڑھیوں سے واپس آ گئیں۔ یہ ان کا

قاعدہ ہی نہ تھا۔ جس لڑکے کی واپسی کے لیے انہوں نے رو رو کر دعائیں کی تھیں، وہ انہیں ہی رلا دینے والا تھا۔

اماں کو یقین تھا سب چراغ کا قصور ہے۔ پر وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ چراغ کے لیے بیرام کی محبت ان کے گلے کا پھندا بن چکی تھی۔ چچی چراغ کو بہلا رہی تھیں۔ اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''رہنے دو افروز! دیکھ لیا تمہاری چراغ نے ہمارے دلوں کو کیسے راکھ کر دیا۔''

چچی ہمیشہ چراغ اور بھابھی میں پھنس جایا کرتی تھیں۔

''وہ کچھ معافی کی بات کر رہا تھا۔''

کفایت نے ادھوری بات سنی تھی۔ ادھورے لفظوں کو جوڑ کر معنی نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چراغ سے ڈرتی تھی، کہہ نہیں پائی تھی۔ اب صورتحال اتنی نازک ہو چکی تھی کہ ''منظور ہے، معافی جیسا کچھ سنائی دیا تھا۔'' اگل کر، اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

چراغ نے روتے روتے سر اٹھا کر اسے اتنی بری طرح سے گھورا کہ کفایت کا دم ہی نکل گیا۔ بقول چراغ کہ اسے چور کہہ دیا تھا اسی پر بھڑکا ہوا لگتا ہے۔ رسوا کرنا چاہتا ہے۔ چچی نے چراغ کی آنکھ کا چور پکڑ لیا۔ وہ کوئی آگ لگا چکی تھی۔ سب اس کے جھوٹ سمجھتے تھے، پھر بھی اسے سچی سمجھ لیتے تھے۔

''یہ بات کب تک چھپائیں گے چراغ!'' چچی نے چراغ کو سختی سے مخاطب کیا۔

چراغ نے دوبارہ رونے کی کوشش کی لیکن اتنے جھوٹے آنسو وہ کہاں سے لاتی، پہلے والے ہی مشکل سے نکلے تھے۔ اب وہ اپنا دم ہی نکال سکتی تھی۔ لیکن ایک چور کے لیے دم دینا کہاں کا عدل ہوتا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کنوئیں کی طرف بھاگتی اور جب تک اسے پکڑ نہ لیا جاتا وہ چھلانگ نہ لگاتی۔

''تمہارے کان میں اذان دی ہے امام صاحب نے! ان کے بیٹے کو ایسے زندہ در گور نہ کرو، وہ شہر کے قاعدے نہیں سمجھتا ورنہ ایسے یہاں نہ آتا۔ امام صاحب کا صبر نہ سمیٹو چراغ!'' چچی کے دل کا ٹکڑا، امام صاحب کے دل کے ٹکڑے کرنے والا تھا۔

''آپ ڈر کیوں رہی ہیں، بتا دیں مردانے میں، بہتر ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں۔'' وہ تو چاہتی تھی وہ مر جائے، ایسے ورنہ ویسے۔ اماں کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ خود جا کر سب کو بتاتی۔

''تمہاری بے خوفی اسے یہاں تک لے آئی ہے چراغ! اتنی نادانی ٹھیک نہیں۔ وہ جان سے گیا تو حویلی کی ساکھ خاک ہو گی۔ لوگ ہم سے تو کیا ہمدردی رکھیں گے، امام صاحب کی پرہیز گاری پر قسمیں اٹھائیں گے۔ سارا شہر ان کی شرافت

کا امین ہے۔'' چچی نے پھر سمجھایا۔

وہ عاجز آ کر اٹھی۔ چچی نے کفایت کو اشارہ کیا۔ وہ تو خود جستجو میں تھی فوراً اس کے پیچھے ہوئی۔ نظر بچا کر چپکے چپکے حور اور نو بہار بھی پیچھے کھسکنے لگی۔ اماں سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھیں۔ چچی کے دل میں انجانا درد سمٹ آیا..... درد..... دل کا درد..... چراغ نے آج تک اس سے کڑوا گھونٹ نہیں بھرا تھا، جتنا وہ اس وقت بھرنے جا رہی تھی۔

''معاف کر دو مجھے.....'' کتنا طیش تھا اس کی سانسوں میں۔

اس نے خاموش نظر سے اسے دیکھا..... دیکھا اور پلٹ کر منڈیر پر چڑھ گیا۔

''اگر میں مجبور نہ ہوتی تو تمہیں یہاں سے زندہ نہ جانے دیتی۔'' کہنے سے خود کو روک نہیں سکی۔

''مجبوری ختم ہو جائے تو یہ شوق ضرور پورا کرنا۔'' سر کو اس کی طرف گھما کر کہا۔

کہنے والے کی آنکھیں سنجیدہ تھی..... سننے والے کی پرشور.....

وہ پیچھے کھڑی اسے گھور رہی تھی..... وہ منڈیر پر کھڑا گردن گھما کر کہہ چکا تھا.....

گہری شام کا شہر روشن ہو رہا تھا..... دو روقت کا نل بجتا تھا.....

ایک تمس..... ایک چراغ.....

اور جان کی امان.....

☆ ☆ ☆

شام کی ہنگامہ خیزی رات کی بے سکونی لائی۔ حویلی کی کوئی عورت سو نہیں پائی۔ دو لقموں سے زیادہ کھایا نہ گیا۔ دل سہمے تھے کہ شہر میں غدر مچے گا۔ گلی گلی، زبان زبان حویلی کا ذکر ہو گا۔ اماں خود کو ملامت کرتی رہیں۔ ان کی تربیت کا کھوٹ تھا۔ بھائیوں کا لاڈ تھا۔ زیادہ بیرام کی بغاوت تھی کہ اسے بھی باغی کیا۔ اس کا مزاج شاہانہ، حکمرانہ اور باغیانہ تھا۔ رات گئے کفایت اپنے جلوس کے ساتھ کھسر پھسر کرتی رہی۔ ان سب لڑکیوں مہریوں کی کوٹھریوں میں چراغ کے نام کا دربار روشن تھا۔ چراغ سے الفت بھی تھی اور اس کے لیے دل میں کھٹاس بھی۔ کوئی اس سے پوری محبت کیسے کر سکتا تھا۔

''پہلے تو مجھے اس سے بہت ڈر لگا، پھر ذرا میرا دل اس کی طرف کھینچا۔''

ہر دوسرے جملے کے بعد کفایت اس کی تعریف کا نکتہ نکال لاتی تھی۔ سب اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتیں تو وہ گڑبڑا جاتی، باز پھر بھی نہ آتی۔

ایک طرف یہ دربار تھا دوسری طرف تخلیہ تھا۔ حور اور مہتاب بھابی نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سو رہی

تھی۔ البتہ پیشانی پر شکن تھی۔ محو خواب دو بدو ہوگی۔ جو چھت پر نہ دے سکی، وہ سزا خواب میں سنا رہی ہوگی۔ کفایت نے من و عن سب نیچے آ کر بتا دیا تھا۔ اماں نے ہر طرح سے پوچھا کہ کیا قصہ ہوا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ اماں منہ پھیر کر چلی گئیں۔ کمرے میں آ کر چچی سمجھاتی رہیں۔

''چراغ.....'' چچی نے مخاطب کیا کہ کچھ سنتی بھی ہو میں کب سے ہلکان ہو رہی ہوں۔

''میں سب سمجھ چکی ہوں چچی.....''

''کیا؟'' انہیں شک تھا۔

''وہی جو آپ نے کہا۔''

''کیا کہا.....'' انہیں شک تھا، شک تھا۔

''شب بخیر چچی جان.....'' اس نے بھرپور جمائی لی اور کروٹ بدل لی۔

چچی جان بستر کے کنارے بیٹھی تھیں۔ اس کا شانہ ہلایا تو وہ سو چکی تھی۔ سب کی نیندیں اُڑانے والا اپنی نیند محفوظ رکھتا ہے۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ بھابھی ہوتیں تو اسے جھنجھوڑ کر جگا تیں، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکیں۔ چراغ ان کی کوکھ کی نہیں، دل کی اولاد تھی۔ شادی کے بعد ایک عرصہ تک وہ بے اولاد رہیں، پھر بیٹے ہو ہو کر فوت ہونے لگے۔ چراغ آئی تو انہیں لگا کہ ان کی مراد بر آئی۔ ان کی اپنی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی چراغ کی جگہ نہیں لے سکا۔ حور اس سے گیارہ مہینے چھوٹی تھی۔ آخر چراغ کی طرف ان کا دل اتنا کیوں لپکتا ہے، ان کی اولاد بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ کچھ لوگ پریم مایا ہوتے ہیں، انہیں دیکھ لو، سن لو، چھو لو، ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ انہیں بھی اس سے شدید محبت تھی۔ وہ بے ادب، بدتہذیب تھی۔ بے حس اور خود غرض بھی..... اور ان کی جان بھی..... اس جان ہونے سے وہ چچی سے بہت کچھ منوا لیتی۔ وہ بھابھی سے بہت کچھ چھپا لیتیں۔

روشنیاں گل کیں۔ اس کے کمرے سے باہر آ گئیں۔

چراغ.....

بے ادب..... بے حس چراغ.....

پانچ بھائیوں کی چراغ، بیرام سے گیارہ سال بعد پیدا ہونے والی چراغ۔

''یہ میری ہے''۔ بیرام نے اسے فوراً گود میں بھر کر سینے سے لگا لیا تھا۔ انگلی سے شہد چٹایا تھا۔ وہ اس کی لاڈلی نہیں سر پھری چہیتی تھی۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، لیکن حویلی کا بڑا بن چکا تھا۔ باپ کی زندگی میں ہی انتظام سنبھال چکا

تھا۔ کچھ بڑے بھائی اور چچا بھی ولی صفت تھے، اس کی سرداری میں خوش تھے۔ اگر وہ خسرو ہوتا تو سارا شہر اندھا کروا کر اپنی آنکھیں بچالیتا۔ یہی سبق وہ اپنی بہن کو سکھاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اماں کے ہاتھ سے یہ سب نکل گیا۔ نہ بیرام پر بس تھا نہ چراغ پر۔

''آپ کی طبیعت ناساز ہے؟'' بیرام سلام کر کے ماں کے قریب بیٹھ گیا۔

انہوں نے خفا خفا ہوں ہاں کی۔ کفایت کھسک گئی۔ تخت پر جا بجا کھاتہ جات کھلے تھے۔ مہریوں، ملازموں کی تنخواہوں کی پوٹلی بندھ رہی تھیں۔ یہ صبح کا وقت ہے۔ دالان میں کھڑی مہتاب اپنے شوہر کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ کب شہر سے باہر گیا، کب واپس آیا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ قریب آئی، سلام کیا جس کے جواب میں برہم نظر ملی کہ دیکھتی نہیں مصروف ہوں۔ وہ شرمندگی سے نظریں چراتی چلی گئی۔ اماں کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

''تمہاری بیوی بہو ہے میری! لونڈی نہیں ہے کہ تم اپنی برہمی کا شوق پورا کرتے پھرو۔ بہن کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے، بیوی کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''چراغ کے علاوہ کس سے خفا ہیں۔'' بیوی والی بات کو اہمیت نہیں دی۔

''ایک تو سونا کھرا اوپر سے ملا سہاگہ.....''

سہاگے نے قہقہہ لگایا۔ ''اب کیا کر دیا چراغ نے.....؟''

''آٹھ پہر سولی ہے تمہاری چراغ!''

''صرف میری چراغ ہے؟ اگر آپ کی نہیں ہے تو بتا دیں کہ اس کے دل کو بھی تسلی ہو۔ ایک ہی چراغ ہے گھر میں اس سے بھی خفا رہتی ہیں۔ رخصت ہو کر چلی جائے گی تو یاد کریں گی۔ میں بھی اس کا دل نہ رکھوں تو کون ہے اس کا۔''

''تم اس کا دل رکھو وہ دوسروں کے دلوں کے ٹکڑے کرے..... بہتر.....''

''اب اس کی عمر ہے کہ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر آنکھ مچولی کھیلے؟'' وہ اماں کو زچ کرنے لگا۔

''انسانوں سے کھیلتی ہے وہ منظور ہے تمہیں۔''

''وہ جو کرے سب منظور ہے مجھے!'' وہ ہنسا۔ ''آپ کو بھی اجازت ہے، اٹھائیں تلوار اور کر دیں قتل عام۔''

''تم اس کے کارناموں پر اتراتے ہو، طوفان مچا کر رکھتی ہے۔''

''اس کی حیثیت ہے کہ طوفان مچا سکے۔ کم عمر ہے، شرارتیں کرتی ہے، آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ خاندان کی رونق ہے۔''

''رونق کم ہنگامہ زیادہ ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے بیرام!''

''میں چاہتا ہوں کہ سب اس سے ڈریں لیکن آپ نہ ڈرا کریں، آپ کو رعایت ہے۔'' وہی زچ کرنا۔

اماں کی خفگی بڑھ گئی۔ ''ماں کی ہر بات کو مذاق سمجھتے ہو، وہ تم پر ہی گئی ہے۔ جو بچ گیا تھا وہ سواری دے کر پورا کر دیا، سارے شہر میں دندناتی پھرتی ہے۔''

''اپنی سواری طاقت کا احساس دلاتی ہے۔''

''اسے طاقت کے احساس کی نہیں عقل کے استعمال کی ضرورت ہے۔''

☆ ☆ ☆

چراغ کی سواری.....

چراغ سے اس کی محبت میں کلام نہیں تھا۔ سواری نے اس محبت کو ممتاز کر دیا تھا۔ لکھنو میں ایک نواب بیگم کی سواری دیکھی تھی۔ اپنی نواب زادی کے لیے بھی فوراً سواری کا انتظام کروا دیا تھا۔ جو صرف اس کی ہوگی۔ اس کی ملکیت میں، اس کی پسند کے مطابق.....

''یہ میری ہی سواری ہے، یہ کیسے معلوم ہوگا۔'' وہ سوچ میں پڑی تھی کہ کیسے اسے اپنے لیے خاص کروائے۔

''تم اسے گھونگھٹ اڑا دو یا اس کی پیشانی پر جھومر جڑ دو۔'' حور نے کامل سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''ورنہ سواری کے گھوڑوں کے پیروں میں پازیبیں پہنا دیں جہاں سے گزرے گی..... چھن..... چھن.....'' کفایت بھی شامل ہوئی۔

''یہ میری سواری ہے دلہن کی پالکی نہیں.....''

''دلہنیں تمہارے آگے کیا بیچتی ہیں، ایک پرچم پر اپنا نام لکھوا کر سواری پر لہرا دو..... چراغ پھڑ پھڑائے.....''

اسے یہ خیال پسند آیا لیکن اماں برا مان گئیں۔ ''سارے شہر میں اپنے نام کا ڈھنڈورا پیٹوں گی..... چراغ کی سواری..... لڑکی کا نام ہر زبان پر آئے گا، ٹھیک رہے گا؟''

''اماں کی پھٹکاری لکھوا لوں..... یہ ٹھیک رہے گا؟'' وہ چڑ گئی۔

چچی اور بھابھی بے ساختہ ہنس دیں۔

''تمہیں تمہاری سواری مبارک ہو میری چراغ!'' چچی نے سواری کی مبارک باد گلے سے لگا کر دی۔

''آداب چچی! ایک آپ ہی تو میری اپنی ہیں..... کاش آپ میری والدہ ہوتیں۔'' کن اکھیوں سے ماں کو دیکھا۔

''کاش حور میری بیٹی ہوتی..... دختر نیک اختر.....''اماں بھی کیوں پیچھے رہتیں۔

''کاش چراغ نور جہاں ہوتی اب تک مر کر اپنے مقبرے دفن ہو چکی ہوتی۔ ہم جایا کرتے فاتحہ پڑھا کرتے۔''حو رنے بے ساختہ کہا۔ چچی نے گھور کر اپنی نیک اختر کو دیکھا۔''مطلب ملکہ نور جہاں ہوتی..... حکم چلایا کرتی.....''حور کو کبھی اپنے دل کے ارمان پورے کرنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔

''حکم چلایا کرتی.....''چراغ نے زیر لب دہرایا۔''وکٹوریہ.....''اس نے ہاتھ اٹھا کر باقی زیر غور خیالات رد کیے۔

''میری سواری کا نام وکٹوریہ ہوگا۔ ایسی سلطنت کی ملکہ کا نام جس کی سرزمین میں سورج غروب نہیں ہوتا۔''ایڑی کے بل ماں کی طرف گھومی۔''اب یہ مت کہیے گا کہ وکٹوریہ کے زبان زد عام ہونے پر بھی تہذیب کی پیشانی پر کوئی دھبہ لگتا ہے۔''

تہذیب کی پیشانی.....

چراغ کی سواری کی پیشانی پر وکٹوریہ لکھوا دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

''تم نے کوئی ہنگامہ برپا کیا ہے چراغ؟''اماں کو دکھانے کے لیے وہ چراغ کو سمجھانے آیا تھا۔

''مجھے آواز نکالنے کا حق نہیں، ہنگامہ کون کرتا ہے۔''وہ ساری دنیا کی بے چاری، دکھی، مظلوم لڑکی۔

دونوں ایک ہی نشست پر فاصلے سے بیٹھے تھے۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ بے تکلفی سے اپنے آغائی کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیا کرتی تھی۔ شہر والوں کو وہ منظر یاد ہی ہوگا کہ کیسے بیرام اسے گھوڑے پر بٹھا کر شہر کی سیر کروایا کرتا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ وہ جب چاہتی مردانے میں بیرام کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اس سے نت نئی فرمائشیں کرتی تھی۔ بیرام کی محبت عمر کے ساتھ ساتھ فصیلیں بدلتی رہی۔ اس نے ہمیشہ اس کے لیے نئے شہر تعمیر کیے۔ وہ نئے جہانوں کا خوگر اور پرانی ساکھ کا دلدادہ تھا۔ ہر معاملے میں لکیر کھینچ دینے پر بضد رہتا۔ چراغ سے محبت کی تب بھی لکیر کھینچ دی۔ سارے خاندان میں مثال بنا دی۔

''تمہاری شکایتوں کے دیوان سن کر آ رہا ہوں۔''

''اماں کو ہمیشہ مجھ سے شکایت رہتی ہے، اب یہی دیکھ لیں کہ کفایت کو میری خبر گیری پر لگا رکھا ہے۔''چوکھٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی کفایت کی طرف اشارہ کیا۔

''ہوا خوری کے لیے جانا تو کفایت کو ساتھ لے جانا، واپسی میں دریا میں پھینک دینا، اجازت ہے۔''

کفایت کا دم خطاء ہوا۔ وہاں سے بھاگی۔ دونوں بہن بھائی دیر تک ہنستے رہے۔

''اماں کا کہا سنا بھی مان لیا کرو چراغ۔'' کتنے پیار سے کہا۔

''چچی سے پوچھ لیں میں اماں کی ہر بات مانتی ہوں، آپ تو مجھے جھوٹا نہ سمجھیں۔'' جھوٹی اپنا سچا ہونا ثابت کر رہی تھی۔

''چچی بھی تمہاری زبان ہی بولتی ہیں۔''

''آپ تو مجھ سے محبت کی زبان بولتے تھے، پھر زبان کیسے بدل لی؟ اب آپ بھی میرے آغائی نہیں رہے۔'' اس کی آنکھوں میں سچ مچ کی نمی آ گئی۔ آغائی نے اسے دیکھا..... دیکھا کہ اسے روتے ہوئے کون دیکھ سکتا ہے بھلا!

''چراغ! ساری دنیا جلا کر راکھ کر دو..... اجازت ہے.....''

اس کی آنکھوں کی ساری نمی سمٹ گئی۔ چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے دل کا طوفان کلی بن کر کھلا۔

بیرام اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا مان راکھ کرنے سے باز رہنا.....'' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''سب جلا کر راکھ کر دو۔'' کفایت ناکام لوٹی تو اماں خود آئیں اور یہ سن لیا۔ گہری سانس لی۔ افروز کو بتایا تو وہ بھاوج کو دیکھ کر رہ گئی پھر ہنسنے لگی۔ فکرمندی کے باوجود اماں افروز کو ہنسنے سے روک نہ سکیں۔ وہ حویلی کا چاند تھیں۔ معصوم اور دل کش۔ چھوٹی سی تھی جب دلہن بن کر حویلی میں آئی تھیں۔ ہر وقت ان کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ دیور کو بیوی کم انہیں سہیلی زیادہ ملی تھی۔ جیٹھانی، دیورانی کے رشتے میں مان لحاظ پورا ہو جائے تو محبت اپنی پختہ جگہ بنا ہی لیتی ہے۔

''میں دیکھتی ہوں چراغ کو شہ دینے میں تمہارا بھی کم قصور نہیں۔'' اماں نے میٹھا میٹھا جتا دیا۔

''ایسی صورت ہے چراغ کی سب کافور ہو جاتا ہے، صرف محبت رہ جاتی ہے۔''

سب کا سکون کافور کر چکی چراغ ان دونوں کی طرف آئی۔ ''میرا ذکر..... میرا تذکرہ ہی ہو رہا ہوگا.....'' طنزیہ کہا۔

اماں نے ایسے ظاہر کیا جیسے نہ سنا نہ دیکھا۔ کفایت کو آواز دی۔ ''تو شک خانے کو دیکھا، مجھے وہاں دیمک کا گماں ہے۔''

''میں دیکھ چکی ہوں، سامان نکلوا کر دھوپ میں رکھا ہے.....'' چراغ کو ترچھی نظر سے دیکھا۔

''میرے کپڑوں کا صندوق بھی دیکھ لینا۔'' چراغ کفایت کی طرف گھومی۔

''کفایت! ادھر ادھر سے ہدایات لینے سے مکمل پرہیز کرنا۔'' سختی سے کہہ کر چلی گئیں۔

اس نے شکایتی نظروں سے چچی کو دیکھا۔ ''کفایت کے سامنے مجھے نیچا دکھا کر خوش ہیں آپ کی سہیلی۔''

''کبھی ماں سے معذرت بھی کرلیا کرو چراغ!'' چچی نے سمجھایا۔

''پیار کرتی ہوں معذرت کرنا ضروری ہے۔'' آنکھیں پیشانی کی طرف گھمالیں۔

''عجب پیار ہے تمہارا..... کاٹ جھیل کرر کھ دیتا ہے.....''

اس نے چچی کو تیز نظروں سے گھورا۔ دھم دھم کرتی چلی گئی۔

''جو نصیحت کرے اس کی گردن پھنسے۔'' چچی بڑبڑائیں۔

☆.....☆.....☆

ماں کے کمرے کا دروازہ کھول لیا تھا لیکن دہلیز پر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ چار اطراف کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وہاں ہر چیز ایسے تھی کہ جانے والا آیا ہی جاتا ہے۔ باپ کو پوری طرح سے اپنایا نہیں تھا گھر کو کیسے اپناتا۔ وہ پاکیزہ گھر تھا، اس کا دل آلودہ۔ مسجد ہی کی طرح کشادہ احاطہ، حوض، اور پھر تین اطراف کمرے اور دالان۔ ایک دن ابا جی کو اس کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ پہچان نہیں سکا کہ اندر جا کر باہر نکلنے والا مسجد کا امام تھا یا کوئی دیوانہ۔

کمرے میں پلنگ، سنگھار میز، اور آرائش کی چند چیزیں تھیں۔ کونے میں ایک بڑا صندوق رکھا تھا۔ نئی نویلی دلہنوں کا صندوق۔ وہ اسی کی طرف آیا اور کھول لیا۔ خوشبو..... خوشبو..... کئی احساس ایسے جاگے جیسے کسی نے میٹھی نیند سے آنکھ کھول کر دیکھا۔ اندھیرے میں ڈوبا محبت کا جہاں یکدم روشن ہوا۔ جانے والے اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں..... چیزوں سے، خوشبو سے۔ یادیں اس کے پاس تھیں نہیں۔ وہ پہلی بار اپنے اس عزیز سے مل رہا تھا جسے وہ سب سے زیادہ عزیز ہوتا۔ اس نے ایک زرتار دوپٹہ اٹھالیا۔

''تمہاری ماں اعلیٰ ذوق، بلند تربیت خاتون تھیں۔'' بوا دہلیز پر کھڑی اس سے مخاطب تھیں۔

وہ ذوق اور بلند تربیت کو نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی ماں کا پہناوا خوب صورت ہوا کرتا تھا۔

''تم اپنی ماں کی طرح ہو، قد البتہ امام صاحب سے چرایا ہے۔''

اسے خواہش ہوئی کہ پوچھے ماں کیسی تھی۔

''ایسی حسین تھی کہ دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا تھا۔ کبھی جو پیشانی پر بل دیکھے ہوں۔ اپنے زیور اتار اتار پکڑا دیا کرتی تھی، کسی کو پریشان حال، روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔''

کبھی نہ مل سکنے والا بیٹا رونا چاہتا تھا۔

''گھر کی عورت کے مرنے کو خانہ ویرانی کہتے ہیں بیٹا! لیکن یہ ویرانی گھر سے زیادہ امام صاحب کی زندگی میں

آئی۔عورت کی خانہ داری ہی تو دنیا داری کی راہ سجھاتی ہے.....راہ ورسم،تہوار،رواج.....عورتیں ہی نبھاتیں،سکھاتیں،اور آگے چلاتی ہیں۔"

بوا ابا جی کی طرف سے اس کے دل کی میل دھونا چاہتی تھیں کہ کیوں امام صاحب گھر سے الگ ہو گئے۔وہ ماں کی سنگھار میز کے سامنے کھڑا تھا۔وہاں کئی ایسی چیزیں تھیں جنہیں وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔چاندی کی عطر دانی اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کی۔اسے کھولا.....اور ناک کے قریب رکھ لیا.....

"تمیز،تہذیب کسے کہتے ہیں بوا؟"بات عورت کی ہو رہی تھی نا،کچھ اسی لیے.....

"ادب،قرینے اور زندگی کے سلیقے کو....."

☆.....☆.....☆

بے ادب چراغ! گستاخ نادان.....

وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی ہے۔یہ قد آدم فرشی آئینہ ہے،اس کے قد سے کہیں اونچا۔حور اپنے جلوس سنگ کمرے میں براجمان ہے۔

"تمہیں اجنبیوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

"انہی سے تو ڈر نہیں لگتا جیسی چاہے درگت بنالو۔"

"اس بار تمہاری درگت بن گئی.....معافی مانگتے ہی بنی....."

سب ایک ساتھ ہنسیں۔اس کا خون کڑھنے لگا۔ان سب نے جیسا تیسا حساب لگا کر یہ بوجھ لیا تھا کہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ اسے گھٹنوں کے بل جھکا گیا تھا۔

"ثابت شد!باہر سے صرف حملہ آور ہی نہیں،"نجات دہندہ" بھی آسکتے ہیں۔"حور نے ہاتھ اٹھا کر ثابت کیا۔

"سب کے حساب برابر کر گیا۔"یہ حور سے چھوٹی نوبہار تھی جس نے دونوں ہاتھ جھاڑے اور دانت چمکائے۔

"لاہور کو بارہ صدمات پہنچے،تیرہواں صدمہ تمہاری پیدائش کا رہا،وہ دن اور آج کا دن بڑی مدت لگی ہمارے زخموں پر مرہم لگنے میں۔"حور تاریخ کی کمان سے تیر داغ رہی تھی۔

وہ چونکی،ٹھٹکی اور۔"لاہور کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا لیکن صدمہ پہنچایا جا سکتا ہے۔"اسے یاد آیا۔بہتر!صدمے سے اس کا یہ مطلب تھا۔

"دانتوں میں کس کی گردن چبا رہی ہیں چراغ بی بی!"کفایت تیز مرچ کھاتی،تیز ہی زبان رکھتی تھی۔

''دوبارہ مجھے بی بی کہا تو تمہاری زندگی کا چراغ کب گل ہو جائے گا میں ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہوں۔''

''جان کسی اور کی لینا چاہتی ہیں جان پر کسی اور کے ڈال رہی ہیں یہ تو شرافت نہیں۔'' کفایت باز نہیں آئی۔

''شرافت تو امام صاحب کا بیٹا دکھا کر گیا ہے۔ اسی لیے اماں بی انہیں معاف کرنے پر راضی نہیں۔''

وہ سب معنی خیزی سے مسکرا رہی تھیں۔ جانتی تھیں کہ اس بار چراغ کے ساتھ کتنی بری ہوئی ہے۔ یہ موضوع تھا کہ پرانا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ چچی واپس اس کی سہیلی بن چکی تھیں۔ لیکن اماں کی ناراضی نے سب کو شیر بنا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی تھیں۔ الٹا کفایت سے باتیں کرنے لگتی تھیں۔ کفایت اٹھلاتی کہ ہائے میری حیثیت آپ سے اُوپر رہی، آپ کی والدہ آپ سے کلام کرنا پسند ہی نہیں کرتیں۔

''چچی! اماں سے کہیں مجھ سے ناراضی ختم کریں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں کیا محبت کرنے والوں کا اتنا حق بھی نہیں کہ تھوڑا تنگ کر لیا جائے۔'' وہ بھاگی چچی کے پاس آئی۔

''تم جن سے محبت نہیں کرتیں، انہیں بھی تنگ ہی کرتی ہو۔'' جتا دیا کہ شاید کچھ احساس ہو۔

''انہیں تو میں خوار کرتی ہوں۔'' بے دام بے لگام کہا۔ ''آپ بھی میری چچی نہیں رہیں۔'' چچی کو خفا چہرہ دکھایا اور لپک چھپک کمرے سے نکل کر، اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی انجان بن گئیں۔ بستر کی چادر درست کی کہ سونے لگی ہوں، جاؤ۔

''اماں معاف کرنے والا شیر دل ہوتا ہے۔'' اپنے مطلب کی سب باتیں اسے یاد ہوتی تھیں۔

''تکلیف پہنچانے والا دل چیر دینے والا ہوتا ہے۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اپنی اولاد کو چھوڑ کر غیروں سے انسیت رکھتی ہیں، کیا میرا دل نہیں دکھتا۔'' وہی چراغ کے جذباتی مکالمے۔

اماں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بستر پر دراز ہو گئیں کہ جاؤ بھئی جاؤ۔

''آپ چراغ سے ناراض ہو کر سو جائیں، صبح جاگیں اور خبر ہو چراغ جا چکی..... چراغ مر چکی۔'' نم آنکھیں، نم آواز۔

ختم شد..... تمام شد..... ماں کا دل ڈھیر ہوا..... تڑپ کر سیدھی ہوئیں۔

''چراغ! اپنی ماں کو سکون سے سونے بھی نہیں دو گی۔''

''سب میرا مذاق اڑا رہی ہیں، وہ منظور ہے آپ کو۔ کفایت تک مجھے منہ چڑاتی ہے، ایک ہی چراغ ہے حویلی میں، چار دن اس کی ناز برداریاں نہیں کر سکتیں۔ معصوم سا دل ہے میرا، بے دھیانی میں کچھ ہو جاتا ہے، میرا کیا قصور۔ میں شرارت کرتی ہوں اور آپ ذری ذری باتوں پر گھبرا جاتی ہیں۔''

''اپنی عادات کی تہذیب کرو چراغ! جواداوہ نرالی جوبات وہ ٹیڑھی۔'' ہاتھ بڑھا کراسے قریب بٹھالیا۔

''اوردل کی خوشی؟'' دوآنسونکل آئے۔زبان کی طرح آنکھیں بھی بروقت کام کرتی تھیں۔

''دوسروں کوتکلیف پہنچا کرکیسی دل کی خوشی.....''

''خوشی پھرخوشی ہے کہیں سے مل جائے۔ میں جھوٹ بولوں تب ٹھیک ہے۔''

''تہذیب کے قرینے کا جھوٹ بدتہذیبی کے سچ سے بہتر ہی ہوگا۔''

''تہذیب.....قرینہ.....مروت.....اللہ!اتنی مشکلیں باتیں نہ کریں.....''

''ہراچھی بات تمہارے لیے مشکل ہے۔تم نے اپنی سواری پروکٹوریہ لکھوایا ہے۔وکٹوریہ حکم سے نہیں حکمت سے بادشاہت کرتی ہے۔عقل کی دلیری اورسوجھ بوجھ کے احساس سے۔''

''آپ تو مجھے شہزادی بھی نہیں بننے دیں گی۔''ماں نے کیا کہا،اس نے کیا سمجھا۔

''حکیم لقمان سے پوچھا گیا،''آپ نے ادب کس سے سیکھا بولے بے ادبوں سے''،میں دیکھتی ہوں کہ تمہیں دیکھ دیکھ کرحویلی کی دوسری بچیاں بے ادبی سے سخت نالاں ہیں۔کوشش میں ہیں کہ تم جیسی نہ ہو جائیں۔تم نے اب تک جو شرارتیں کیں،ہم نے سمیٹ لیں،لیکن طوفان سمیٹے نہیں جاسکتے چراغ!''اماں نے سوچا شاید اب وہ کچھ سمجھداری سے کام لینے لگے۔

''مجھے طوفان نہ کہیں۔''دوسے چارآنسو۔

''تم آئندہ ایساویسا کچھ نہیں کروگی،قسم اٹھاؤمیری.....''

''قسم اٹھائی تو جان سے میں جاؤں گی.....میں قسمیں اوروعدے نہیں نبھاسکتی اماں!''

وہ قسمیں اوروعدے نہیں نبھاسکتی تھی،وہ چراغ تھی۔

☆.....☆.....☆

قسمیں،وعدےاوروفاداریاں.....

چند دن شرافت سے گزارکر،اچھی والی چراغ بن کر،دکھا کراس نے ان تمام بچیوں کی خبرلی جو بےادب چراغ سے خائف ہوکرتہذیب وقرینہ سیکھ رہی تھیں۔کمرے میں کفایت سمیت سب کی جماعت حاضرتھی۔سب نے اپنی جانوں پرقسم اٹھائی کہ یہ اماں بی کاذاتی خیال ہے۔وہ اسے سخت ترین پسند کرتی ہیں۔اس پرجان چھڑکتی ہیں۔وہ ان کی آنکھوں کا نور،دل کاچراغ ہے۔

سب کے دلوں کی چراغ، اپنی قیمتی چیزیں ان سب میں تقسیم کر رہی تھی۔ بالکل! وہ درباری خرید رہی تھی۔ یعنی پورا دربار ہی۔ چچی کو محبت سے، اماں کو آنسوؤں سے اور باقیوں کو ان چیزوں سے خرید لیا کرتی تھی۔ انہیں کشتی رانی کا لالچ بھی دیا۔ کفایت کے کان الگ سے کھینچے کہ اتنا با ادب، باتمیز ہونے کی ضرورت نہیں کہ اس کی مثال دے کر اسے نیچا دکھایا جائے۔ کفایت نے بھی اپنی جان کی امان پائی، کشتی رانی وہ بھی کرنا چاہتی تھی۔

کفایت!

وہ ساری حویلی کی پھرکی تھی۔ ہر جگہ، ہر ایک کے پاس دکھائی دیتی۔ چچی افروز کے میکے سے آئی خاص ملازمہ کی بیٹی تھی۔ چراغ اور حور کے ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھی۔ کفایت نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماں داغ مفارقت دے گئی۔ وہی کفایت کو ایسا طاق کر گئی تھی کہ وہ حویلی کے انتظام کی نگران بن گئی۔ چچی کے میکے سے جو چیز آئی کمال آئی۔ خود چچی باکمال، باصفت تھیں۔ اماں بی کا سارا نظام کفایت کے بغیر رک جاتا تھا۔ اگر کبھی کفایت بیمار ہو جاتی تو اماں اس کی کوٹھری پیغام پر پیغام بھجواتیں کہ بچی اٹھ بیٹھو! ساری حویلی بیمار پڑ جائے گی ورنہ۔ اس کی کوٹھری میں آدھے سے زیادہ سامان تو چراغ کا چھوڑا ہوا رکھا تھا۔ چہرہ مہرہ روشن تھا۔ سلیقے قرینے سے رہتی تھی۔ چہکتی پھرتی تھی۔ کالے سیاہ لمبے بال تھے۔ ان کے ساتھ تماشے کرتی رہتی تھی۔ کبھی ایک چوٹی، کبھی دو اور کبھی چار بھی کر لیتی تھی۔ اور ہاں! چہرے پر جگہ بدل بدل کر سیاہ تل ٹھوکتی رہتی تھی۔ چراغ کے ہاتھوں تکلیف پہنچتی تو پیشانی پر بنا لیتی کہ ہمارا تو نصیبا ہی خراب ہے۔ خوش ہوتی تو ہونٹ کے پاس یا ٹھوڑی کے قریب لگاتی۔ خوبصورت لگنا چاہتی تب بھی یہی کرتی۔ اماں کی خاص لاڈلی تھی۔ جن کی طرح ان کے سامنے حاضر رہتی تھی۔ اماں کہتیں دوسروں کو آواز دے کر بلانا پڑتا ہے، کفایت کا خیال ہی کر لو تو حاضر ہو جاتی ہے۔

اماں کی حاضر ناضر چہیتی کفایت اس کی ڈولی کے سنگ چل رہی تھی۔ حویلی والیوں کی ڈولیوں کا قافلہ سنہری مسجد کی سمت رواں دواں تھا۔ کئی دن پیادے شہر میں اعلان کرتے رہے تھے کہ دلی سے نامی گرامی مولانا کی آمد ہے، خاص عورتوں کے لیے بیان کا اہتمام ہے۔ یہ قافلہ وہی بیان سنے جا رہا تھا۔ آگے پیچھے اتنی ڈولیاں حویلی سے نکلی تھیں کہ کہار با پیادہ شاہی رسالہ لگتے تھے۔ ڈولی میں بیٹھی چراغ، ڈولی سنگ چلتی کفایت ..... وہ اس کی طرف منہ کر کے کچھ نہ کچھ بتاتی جاتی۔ خود وہ بھی پردہ کھسکا کر جھانک لیتی۔

"بارات....." کفایت چہکی۔

کہاروں سے کہو راستہ نہ بدلیں۔" چراغ نے چلا کر کہا۔

"آہستہ بولیں! باہر تو زبان اندر رکھ لیں۔" کفایت نے ڈانٹ دیا۔

کئی ڈولیاں آگے نکل چکی تھیں، کچھ بارات دیکھ کر راستہ بدل گئیں۔ ڈھول تاشوں کا شور تھا۔ دروازوں، دہلیزوں، چھتوں کے پیچھے کتنی آنکھیں بارات دیکھتی تھیں۔ بارات دیکھنے والیاں ہمیشہ پردوں کے پیچھے چھپتی ہیں۔ اپنی بارات کے لیے بھی۔ اس نے دلہا دیکھنے کے لیے ڈولی کے پردے کو کھسکایا لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ باراتیوں کا ہجوم ہی دکھائی دیا۔

''دلہا کہاں ہے؟'' کفایت کے رخ منہ کر کے پوچھا۔

کفایت خود بارات دیکھنے میں محو تھی۔ بے اعتنائی سے کہا۔ ''یہیں ہے..... گھوڑے سے اتر آیا ہے۔''

گھوڑے سے اتر آیا تھا..... اس نے ڈولی کا پردہ تقریباً اٹھا دیا۔ وہاں نہ دلہا تھا نہ شہ بالا..... وہاں قلعے کا قیدی تھا..... اندر والی کی نظر باہر والے پر پڑی..... اور باہر والے نے بے اعتنائی سے نظر ایسے بدل لی جیسے کسی بہت ہی خراب چیز پر پڑ گئی ہو۔ اللہ معاف کرے۔ چراغ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بارات پر گلاب اور عطر کا چھڑکاؤ جاری تھا۔ وہ جورک کر بارات دیکھ رہا تھا گلاب کی پتیاں اس کے شانے پر گریں، بالوں میں الجھیں۔ وہ عطر ہوا..... معطر ہوا.....

یہ آگ ہوئی..... آتش فشاں ہوئی.....

ہجوم بڑھ گیا، کفایت نے کہاروں کو راستہ بدلنے کا کہا۔ کچھ افراتفری، کچھ اس کی قسمت، آگے والے کہار سے ڈولی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ یہ ڈولی سے باہر گرتے گرتے بچی۔ اس کی چیخ نکلی۔ قیدی کی بے اعتناء آنکھیں بے اختیار چمکنے لگیں۔ پھر وہ منہ گھما کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔

''آپ کا کبھی زبان دراز بدتہذیبوں سے واسطہ پڑا ہے بوا؟''

''نہ بیٹا! دیکھا سنا بہت واسطہ کبھی نہیں پڑا۔''

''اگر واسطہ ہو تو کیا کریں گی.....''

''سچ کہوں تو بے ادبی مجھے تو راس نہیں، خیال سوجھتا ہے کہ ایسے ویسے گستاخ کی بے نقط ٹھکائی کروں گی۔''

''بے نقط ٹھکائی.....'' اس کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ سر اٹھا کر عطر معطر قہقہے لگانے لگا۔

کہار سجھاؤ سے سنبھلے..... گرتے پڑتے ڈولی کے مچلتے پردے سے اسے ہنستے دیکھ کر اس کی جان راکھ ہوئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہا۔ یہ کہار اچھے تھے اس کی ناک کٹوا دی۔ اسی لیے تو وہ گھوڑوں کو پسند کرتی تھی۔ وکٹوریہ پرمان کرتی تھی۔

سنہری مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کفایت نے دیکھ لیا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ اب وہ کیا کرتی اس کا کوئی قصور بھی ہو۔ اسی نے کہا تھا اسے بارات دیکھنی ہے۔ اب دلہا نہیں دکھائی دیا تو وہ کیا کرتی۔ مسجد کی بالائی منزل کے حوض کی بہت شہرت تھی۔ یہ پہلی مسجد تھی جس کا حوض ایسے بنا تھا۔ کفایت اسی حوض سے وضو کر رہی تھی اس نے پیچھے سے آ کر اس کا پورا سر

پانی میں ڈبو دیا۔

"مجھے رسوا کروا دیا..... ہوش سے کام نہیں لے سکتی تھی۔"

کفایت بے چاری نے خود کو پانی سے آزاد کروایا۔ بال وال سب بھیگ گئے۔ کاجل پھیل گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک کی دو بنا کر سب کو بتائے اسے چڑائے کہ امام صاحب کے بیٹے کے قہقہوں نے اسے آگ بگولہ کر دیا ہے۔

"کچھ رسوائیاں نصیب میں ہوتی ہیں ان سے بچ کر بھاگا نہیں جا سکتا۔" کہہ کر وہ اماں بی کے پیچھے بھاگ گئی۔

رسوائی..... سودائی.....

☆.....☆.....☆

سودائی.....

مہینے میں ایک مقررہ دن سب کی شکایتیں نپٹائی جاتی تھیں۔ نوکروں، مہریوں، ماماؤں کے آپس کے جھگڑے اور لین دین کے تنازعے وغیرہ۔ ان کی کوٹھریوں میں ضروریات کی کمی بیشی، چھٹی کی عرضیاں، معمولی توڑ پھوڑ کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ لیکن قیمتی چیزوں کی توڑ پھوڑ پر ان سب کی پیشی ہو جایا کرتی تھی۔ ہرجانہ تو ان سے کیا لیا جاتا، کفایت انہیں کوئی سخت کام سونپ دیتی تھی۔ کبھی کفایت کی سخت نگرانی کی ہی شکایت ہو جاتی تھی کہ ہر وقت ہمارے سروں پر سوار رہتی ہے۔ ہمیں سانس بھی نہیں لینے دیتی۔ آپس میں ان کے ادھار لین دین کے معاملات بھی اماں بی دیکھ لیتی تھیں۔ تہواروں کے لیے ان کے کپڑوں کے معاملات، کسی خاص میلے میں جانے کا انتظام ہوا جاتا تھا۔ حویلی کا سارا انتظام اماں اور چچی ہی دیکھتی تھیں۔ چچی نے انہیں اتنا لکھنا پڑھنا سیکھا دیا تھا کہ اب دھوبن پتھر جوڑ جوڑ کپڑوں کا حساب نہیں کرتی تھی۔ یا دیواروں پر لکیریں نہیں کھینچتی تھی۔ کفایت کا لکھنا پڑھنا بھی چچی کے سر ہی تھا۔ اس کی لکھائی کمال تھی۔ کفایت نے جو کام کیا، چچی اور اماں کا دل ہی خوش کیا تھا۔

دو دن بعد لگنے والا دربار، دو دن پہلے ہی لگا تھا۔ مہترانی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

"میرا جی پریشان تھا، دل کو دھڑکا لگا تھا۔ کفایت کی منت کرتے تھے کہ بی ایک خط ان کو لکھ دو، ان کے پاس فرصت نہ تھی، چراغ بی نے کہا بے وجہ منت کرتی ہو لاؤ میں لکھ دوں۔"

"لاؤ میں لکھ دوں۔" اماں کی آنکھ پھڑکی۔

کفایت نے دونوں خط پکڑے ہوئے تھے۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی، کھنکھار کر حلق صاف کیا۔ ایک نظر سامنے بیٹھے ہجوم پر ڈالی۔ اور "دیوانِ چراغ" پڑھنا شروع کر دیا۔

''سلام دعا کو میرا جی نہیں۔تمہارا خیال آتا ہے تو من بوجھل ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ابا نے کیا دیکھ کر تم سے دو بول پڑھوا دیے۔ یہ میرا ہی صبر ہے کہ تم سے راضی رہنے کا ڈھونگ کرتی ہوں، پر جی ہی جانتا ہے کہ کیسے یہ بھاری سل اٹھائے ہوئے ہوں۔ میں برائی نہیں کرتی لیکن سچائی بھی کب تک چھپا کر رکھوں۔ جس حال میں اللہ نے رکھا راضی باضی رہی، اب قسمت ہی پھوٹی تھی تو تم سے بھی کیسا گلہ۔ ویسے بھی میرا جی دنیا سے ہی بیزار ہوا کہ میں دنیا داری سے ہی منہ موڑتی ہوں، میری مانو تو دوسری شادی کر لو۔ بلکہ میں اجازت دیتی ہوں۔تم سے میرا سنگ نہیں۔ یہ دل تم سے اُٹھ چکا، بلکہ اوب گیا۔واویلا کرنے کی تمہاری حیثیت نہیں، شور ڈالو گے تو اپنی ہی عزت داؤ پر لگاؤ گے۔بہتری ہے کہ چپ رہو اور کسی اپنی جیسی خبطی دیوانی عورت کو دیکھ کر گھر بسا لو۔کوئی مجھ جیسی کوڑھ مغز، آنکھ کی اندھی ہو گی تو تمہارے ساتھ بس جائے گی۔خط کے جواب کی ضرورت نہیں، تمہیں ہی سات سلام۔''

آخری سطر پڑھتے کفایت ہنسی قابو میں کرتے کرتے بے دم ہو گئی۔مہترانی بے چاری دہائیاں دیتی رہ گئی۔ جوابی خط میں بھی شکووں شکایتوں کے دفتر جاری تھے کہ ''کہ ایسا ہی مجھ سے جی پریشان تھا تو اب تک خاموش کیوں رہی۔سب کہہ دیا ہوتا، میں بھی دوسرا نکاح کر چکا ہوتا۔گھر سے دور تمہارے لیے محنت مزدوری کرتا ہوں، تم جلی کٹی سناتی ہو۔اب اس عمر میں انہیں یاد آیا ہے کہ میں خبطی اور دیوانہ ہوں۔خود تو جیسے فارسی مکتب پڑھ چکی ہیں اور کہیں کی رئیس زادی ہیں۔''

رئیس زادی رو رہی تھی۔ پلو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔اماں نے جلدی سے کفایت سے جوابی خط لکھوایا۔اپنا ذکر کیا، جیسے تیسے وضاحت دی کہ خط لکھنے والے نے شرارت کی ہے، درگزر کر دو میاں۔وہاں سے جس نے جوابی خط لکھا تھا اس نے یہ عقل مندی دکھائی تھی کہ چراغ کا لکھا خط بھی ساتھ بھیج دیا تھا۔ورنہ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ دوسرے نکاح کی خبر ہی آتی۔خط کا سلسلہ تمام ہوا تو دوسرے مسئلے سنے گئے۔ نپٹائے گئے۔سب جا چکیں تو اماں اور چچی تخت پر اکیلی رہ گئیں۔ پان دان کھسکا کر چچی خاموشی سے پان لگانے لگیں۔ہونٹوں میں ہنسی مچل رہی تھی۔نظر اٹھا کر بھاوج کو دیکھا۔دونوں کی نظریں ملی اور.....

''میں برائی نہیں کرتی لیکن سچائی بھی کب تک چھپا کر رکھوں۔''چچی نے نقل اتاری۔

''اب قسمت ہی پھوٹی تھی تو تم سے بھی کیسا گلا۔''دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

خط کی بات.....

خط کا ذکر.....

☆.....☆.....☆

ایک خط فرہاد امانی کے نام:

وہ آتش دان کے سامنے بیٹھا ایک عدد خط پڑھ رہا ہے۔ یہ محبت نامہ تھا نہ اقرار نامہ بلکہ ایک عدد ہدایت نامہ تھا جو خالہ کی طرف سے آیا تھا۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں لکھا خط تھا۔ جس کا مقصد کچھ یہ تھا کہ چراغ کو خط لکھنا چاہتے ہو تو ''حال احوال لکھنا، دل کا حال نہیں''۔ اس نے جاندار قہقہہ لگایا تھا۔ اس کی خالہ کے الفاظ کا چناؤ کمال تھا۔ اصل بات سمجھا دی تھی اور برا لگنے جیسی گنجائش بھی نہیں رہنے دی تھی۔ جوابی خط میں بعد از سلام بس اتنا لکھا۔

''منظور ہے خالہ جان.....''

دونوں کی نسبت طے تھی۔ وہ پڑھنے انگلستان گیا تھا۔ ایک خط میں اچانک چراغ سے خط و کتابت کی اجازت طلب کی تھی۔ بیرام کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اماں کو اعتراض کم ڈر زیادہ تھا۔ چراغ سے خط لکھنے کے لیے کہا، تو وہ شرمائی کم، مسکرائی زیادہ تھی۔ شاید خوش ہوئی تھی۔ اسی خوشی میں قریبا ایک صدی کا وقت لگا کر سجا بنا کر بہت شوق سے خط لکھا..... خط لکھا..... خط تمام لکھا..... دل چھوڑ کر باقی حال احوال جناب لکھا۔ جس خط کا جواب بہت جلدی آیا..... خط آیا..... خط پایا..... کھول کر پڑھتے ہی چہرے کا رنگ متغیر ٹھہرایا۔

ہونٹ بھینچ گئے۔ پھر..... پھر..... اس نے خط پرزے پرزے کر دیا۔ پیروں میں مسل دیا۔ کفایت نے نظر بچا کر پرزے سمیٹ لیے۔ حور کے ساتھ مل کر پرزے جوڑ لیے۔ اور خط کا راز پا ہی لیا، جو کچھ ایسے تھا۔

''خط آیا، خط پایا، کھول کر آنکھوں سے لگایا.....

دل سے، دماغ سے، سوچ سے، ہر انداز سے پڑھنا چاہا.....

افسوس! ہر بار سمجھ سے بالاتر پایا..... ایک لفظ جو سمجھ آیا.....''

اتنا پڑھ کر حور تو ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ بھاگی چراغ کے پاس آئی اور بلند آواز سے خط پڑھ کر سنایا۔ وہ پاؤں پٹختی اماں کے پاس آئی۔

''ولایت صاحب کو سمجھا دیجئے گا کہ مجھے خط لکھنے کی گستاخی نہ کرے، میرا ذکر نہ کرے، میرا تذکرہ نہ لائے، مجھ سے کوئی تعلق خاطر میں نہ رکھے۔'' وہ غصے میں حکم نامہ سنا گئی۔

''دیکھا افروز! صرف ایک خط پر یہ حال ہے، دوسرے تیسرے پر تو یہ ولایت جا کر اس کا گلا گھونٹ دے گی۔''

چچی اس کے تہذیب یافتہ کلام پر فدا ہو گئیں۔ ''بہتر ہے کہ اسے سبق ملے۔ ضرور کچھ ایسا لکھا ہوگا جو اسے برا لگا۔''

''اسے سارا جہاں برا لگتا ہے۔ کتنی باتیں بنا لیتی ہے سلیقے سے وہ باتیں لکھی نہیں گئی۔ جس کو شوق ہے اسی کو فوق

ہے۔"

جس کو شوق ہوا تھا خط و کتاب کا، فوت بھی وہی ہونے والا تھا۔ ولایت صاحب کے آگے پیچھے کتنے ہی خط اس کے نام آئے۔ اس کے کمرے میں لا کر رکھ دیے جاتے، وہ ہاتھ تک نہ لگاتی، کفایت کو آواز دیتی۔ "اسے اٹھاؤ....."

"کیسے؟" وہ انجان بن کر آس پاس دیکھتی۔

"اس ولایتی پرزے کو..... باغ کے گندے سندے خشک مشک پتے اکٹھے کر کے آگ لگاؤ، اور اپنے گندے سندے ہاتھوں سے اس پرزے کو اس میں جھونک دو۔ یہ مجھے دور دور تک کہیں دکھائی نہ دے۔"

کفایت نے اپنے گندے سندے ہاتھوں کو دیکھا، پھر خط کو۔ "اگر اس خط کو سزا دینی ہے تو اسے میں اپنے پاس رکھ لوں۔" خط اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ جھوم کر کہا۔ لہک کر دکھایا۔

"ایسے ہی سینے سے لگائے لگائے آگ میں کود جا کم بخت!"

خوش بخت ایڑی کے بل اٹھلا کر گھوم گئی۔ اماں نے خطوط کا یہ حال دیکھا تو خط لکھ کر اسے سمجھایا کہ "رہنے دو میاں! کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ چوک نہ تم سے ہوئی، نہ ہم سے ہوئی۔ یہ تو کوئی مقدر ہی کی کارستانی لگتی ہے۔"

مقدر کی کارستانی..... ولایتی پرزہ.....

نواب فرہاد امانی..... شہزادی چراغ بی بی.....

ترتیب سے چلتی ہر شے میں ایک "گھڑ سوار" گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے.....

"ولایتی صاحب..... ہونہہ....." کفایت کیا جلاتی اس نے ہی شمع پر رکھ کر ایک ایک خط جلا دیا۔

خط کی بات.....

خط کا ذکر.....

☆.....☆.....☆

ایک خط محبوب خان کے ہاتھ!

"خط لکھوانا ہے..... آؤ بیٹھو....." بازار میں خط خانے میں بیٹھے محبوب خان نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"خط....." بازار سے گزرتے شمس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں خط..... ایک خط..... ضروری خط....."

اپنے سامنے کاغذ پھیلاتے، قلم کو سیاہی میں تر کرتے اس نے شرارت سے کہا۔

قیدی ہنس دیا..... چور مسکرا دیا.....

ایک خط چراغ کے نام.....

چور کی طرف سے.....قیدی کی جانب سے.....

☆.....☆.....☆

شمس نے خط میں کیا لکھوایا؟

چراغ نے خط کو کیسا پایا؟

یہ ایک معصوم سا خط ہو گا یا چراغ کو چراغ پا کرتا خط؟

پڑھنے کے لیے پورا ایک مہینہ انتظار کریں۔۔۔۔

Mushak Baam ✓

Mushak-e-baam ✗

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

مشک بام

''لاہور را بجان برابر خریدہ ایم''

جان دے کر خرید لینے والا بازار کے کچھ دام معلوم کرنے آیا ہے۔ شہر کی خبر لینے۔ کہیں تنگ کہیں پتھریلی گلیوں سے گزرتا ہے۔ ''ڈولی اتروا ایے لو'' دلیزوں سے کہاروں کی صدائیں سنتا ہے۔ جان برابر قیمت چکا کر خریدے شہر کو آج جاننے نکلا ہے۔ ''شہر میں نئے لگتے ہو کوئی پرانا لٹیرا الوٹ نہ لے آؤ مجھ سے معاملات کھرے کرو'' معاملہ کھرا کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ گھر کے ساز وسامان کی دکان تھی اس کا کیا کام۔ اسے معمول سے زیادہ ہجوم لگا۔ مامائیں بھاگی دوڑی پھرتی تھیں۔ بچے برفی والے کی طرف زقندیں بھر رہے تھے۔ ''آنکھ والو دل بڑی نعمت ہے اس دل سے میری صدا سنو میرے کشکول میں محبت کی خیرات ڈالتے جاؤ''۔ دل والے نے محبت کا ایک سکہ ڈال دیا۔ سونے کی اینٹیں سوناروں کی دکانوں میں کھلی پڑی ہیں۔ کھلا ہی باؤلی کا دروازہ ہے۔ اور سفید چاندنی بچھی ہے، سفید تہبند، سفید ہی کرتا پہنے لالہ جی حقہ پیتے حساب کتاب دیکھتے ہیں۔ اتنے اجلے اجلے کیوں ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظر ملی۔ انہوں نے اپنا سلام کیا، اس نے اپنا جواب دیا۔ دونوں مسکرا دیے۔ ''ابا جی کا شہر اچھا ہے''، اس نے زیر لب کہا اور سر گھما کر بازار کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ عین بازار کھڑا تھا۔

''تم جانتے ہو تم کہاں کھڑے ہو۔'' وہ آگے بڑھ جاتا اس سے پہلے اس نے آواز دے کر پوچھ لیا۔

''میں کہاں کھڑا ہوں......'' وہ رک کر دیکھنے لگا کہ اب کیا گستاخی ہو گئی۔

''شارع حب......'' خط لکھنے والے نے جیسے کوئی راز افشاں کیا۔

''یہ کیا ہے......'' ہر روز ایک نیا راز کھلتا ہے۔ اس شہر کے پاس آخر کتنے راز ہیں۔

''محبت کی راہ گزر......کوچہ جاناں۔'' مسکرا کر بتایا۔ بڑے بڑے دانت۔ سفید سفید دانت۔

''جھوٹ بول رہا ہے، یہ کوچہ جاناں نہیں کوچہ دیواناں ہے۔ یہاں دیوانوں کی بہتات ہے۔'' قریب سے کسی نے ہانک لگائی۔

اس نے آس پاس دیکھا اسے دیوانہ نظر آیا نہ محبت۔ ''کیا یہاں محبت ملتی ہے؟''

''محبت کہیں سے بھی مل سکتی ہے۔''

''پھر کیا یہاں محبت بکتی ہے؟''

''تمہارے پاس دام ہیں محبت خریدنے کے؟''

وہ ہنس دیا۔ ''دام بولو۔''

اس کے شانے پر اپنی لمبی چھڑی رکھی، ''خود کو چھوڑ جاؤ اور بھول جاؤ کہ محبت کے دام دیوانگی ہے۔''

کہ محبت کے دام دیوانگی ہے.....

دیوانے نے قہقہہ لگایا۔

''کہ جان برابر قیمت چکا کر شہر خریدا ہے جان دیے بغیر دل کیسے خرید لوگے۔'' اب چھڑی دل پر رکھ کر ضرب لگائی۔

''مجھے اتنا دیوانہ نہیں ہونا۔'' وہ ہنسنے لگا۔ دل پر سے چھڑی کو ہاتھ سے پرے کیا۔

''پھر محبت کا نام نہ لینا.....''

محبت کا نام نہ لیا..... محبت کو الوداع کیا.....

دن تھا..... روشنی تھی..... بازار تھا..... شارع حب تھی..... لکڑی کے تخت پر خوشنما قالین بچھا تھا۔ اس تخت پر کئی سادہ کاغذ اور کچھ مہر بند خط پھیلے پڑے تھے۔ محبت لکھنے والا اب قلم کو سیاہی سے تر کر رہا تھا۔ ایک نظر اسے دیکھتا ایک نظر خط پر ڈالتا تھا۔ تخت کے کنارے پر خط لکھوانے والا بیٹھا دھیمی آواز سے کچھ بول رہا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔

''یہاں ایک دیوانہ رہتا تھا دن بھر مشقت کرتا رات بھر دیوانگی بڑبڑاتا، اپنی گم نام محبوبہ کے نام محبت نامے لکھتا اور انہیں راوی کے سپرد کر دیتا کہ ایک دن ضرور اس کی محبوبہ تک پہنچ جائیں گے۔''

''گیلے خط.....'' وہ حیران تھا۔

''محبوبہ دریا میں مچھلیاں پکڑنے جائے گی تو واپسی پر خط بھی لیتی آئے گی۔'' ٹھونک بجا کر آفتابہ خریدنے والے نے وجہ سمجھائی۔ جہاں تک آواز پہنچی وہاں تک قہقہے چھوٹے۔ وہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ خط لکھنے والا بھنا گیا۔

''وہ دیوانہ کہاں ہے؟''

''اس دیوانے کی تو خبر نہیں لیکن وہ اپنی قلم دوات اس کے لیے چھوڑ گیا۔'' سامنے والا دکان دار قریب آ کر گفتگو میں شریک ہوا۔

''یہ لو تمہارا خط تمام ہوا.....''خط تمام ہوا، اسے سپرد طلبگار کیا۔

''کیا دام ہوئے؟''خط لکھوانے والے نے شرما کر پوچھا۔

''محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی میرے دوست!''شمس کو متاثر کرنا چاہا۔

''خوب!لاؤ پھر۔''وہ خط لے کر چلتا بنا۔

''محبت کی نہیں ہوتی لیکن محنت کی ہوتی ہے میرے بھائی!''اٹھ کر اسے آواز دے کر روکنا پڑا۔

شمس نے اپنی آنکھ کی کمان کھجائی۔وہ دلچسپی سے سب دیکھ رہا تھا۔

''میرا نام بہادر خان ہے۔''محبت کے دام صندوقچی میں رکھے۔واپس تخت پر اپنی لکھنے کی رحل کے سامنے بیٹھ گیا۔

''لیکن یہ محبوب جان کے لقب سے مشہور ہے۔''پھر کہیں سے آواز آئی۔اس نے بھنا کر کہنے والے کو آنکھیں دکھائیں۔

''محبوب جان بھی برا نام نہیں ہے محبت سے کوئی کچھ کہے برا نہیں ماننا چاہیے۔وجہ اس نام کی میں خود بتا دیتا ہوں میں دلوں کی تنگی دور کرتا ہوں۔میرے لفظوں میں ایسا جادو ہے کہ بس جس تک پہنچ جائیں وہ کھنچا چلا آتا ہے۔''

''اس کا باپ اور بھائی بھی۔''پھر کوئی ہانکا۔

''تم ادھر ادھر سے کان لپیٹ لو!بتاؤ کہ خط لکھوانا ہے.....آؤ بیٹھو.....''

''خط.....؟''

''ہاں خط.....ایک خط.....ضروری خط.....''

اپنے سامنے سادہ کاغذ پھیلاتے،قلم کو سیاہی میں تر کرتے اس نے شرارت سے اسے یاد دلایا کہ اسے ایک خط لکھوانا ہے۔بہت ضروری خط۔

''اگر مجھے خط لکھنا ہوگا میں خود لکھ لوں گا۔''قیدی ہنس دیا۔چور مسکرا دیا۔

''تم خط سیاہی سے لکھو گے میں محبت سے لکھوں گا۔دیکھو میری خطاطی کیا تم ایسا لکھ سکتے ہو؟''اپنی لکھائی کا نمونہ سامنے کیا۔لکھائی واقعی خطاطی تھی۔پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ہر لفظ سے محبت پھوٹی پڑ رہی تھی۔کہیں بیل بوٹے بھی بنے تھے۔

''ایسی خوبصورت تحریر پڑھے بغیر ہی سیدھا دل پر اثر کرتی ہے۔لاؤ میں تمہارا مضمون تیار کرنے کی کوشش کرتا ہوں، نئی قلم لوں گا۔''اس نے صندوقچی سے نیا قلم نکالا۔اسے تراشنے لگا۔''فکر نہ کرو اگر تمہیں سلام دعا کا خیال نہیں تو وہ میں خود لکھ دیتا ہوں۔''

سلام لکھا جانے لگا.....

''سلام دل و جانم! رخِ روشن، پہلوئے کمال! سلام اے جانِ بہار جان آفتاب! سلام ہو چاند و چاندنی کی ملکہ کہ سرخاب تمہارے پر، سلام اے نور جہاں کہ.....''

''یہ سب کون ہیں؟'' وہ ہونق سن رہا تھا۔

''سلام.....''

''اتنا لمبا سلام.....''

''ابھی تمہاری عجلت پسندی کی وجہ سے اسے مختصر کیا ہے۔'' معصومیت سے بتایا۔

''اگر عجلت پسندی نہ ہوتو یہ سلام ہی اتنا طویل ہو کہ اس خط کو اٹھا کر لے جانے کے لیے چار پیادے درکار ہوں گے۔'' اس کا ہمسایہ دکاندار پھر بولا۔

''یہ خط تم اسے دو گے کیسے؟'' ہمسائے کو نظر انداز کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لکھوانے والا اناڑی ہے۔ سب اسے ہی لکھنا پڑے گا لیکن اسے منظور تھا۔ وہ دنیا میں آیا ہی اسی کام کے لیے تھا۔ شمس سوالیہ اسے دیکھنے لگا۔

''اس کا بھی انتظام ہے لیکن دام زیادہ لگیں گے۔''

''یہ اس کی آنکھ دیکھ رہے ہو یہ انہی داموں کے چکروں میں اٹھی، مطلب ٹوٹی پھوٹی ہے۔ اور وہ دیکھو سامنے اس کی اجرت پر کل وہ خط پہنچانے گیا تھا کہ پیٹ کی آگ بہت کچھ کرواتی ہے، معالج نے پتھر کو آگ پر تاپ کر ہڈیوں کی سینکائی کا کہا ہے۔ فی الحال یہ دھوپ سے سینکائی کر رہا ہے۔ خط پہنچانے گیا تھا اب خود پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ شہر میں آدھے سے زیادہ فساد اس کے ان خطوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ خط پہنچاتے بھی ہیں اور جوابی رقعہ لکھنے کی خدمات بھی پیش کرتے ہیں اتنے میں پکڑے جاتے ہیں۔''

''حد ادب.....'' وہ بادشاہوں کے انداز میں بھڑکا۔ اپنا قلم اٹھا کر لہرایا کہ ورنہ تمہاری موت کا پروانہ جاری کر دوں گا۔

''دام.....؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''خط دے کر آنے میں ایک آنکھ، ایک ٹانگ، خط پڑھ کر آنے میں دو آنکھیں دونوں ٹانگیں..... بولو کیا چاہیے؟'' ہمسایہ پھر بولا۔

''دراصل یہ شادی شدہ ہیں ان کی زوجہ انہیں پھٹکار زدہ رقعے لکھتی ہیں اسی لیے یہ خائف رہتے ہیں۔''

اس نے گہری آہ بھری۔ ''یہ اسی کے لکھے خطوں کا انجام بھگت رہا ہوں۔''

''نوجوان..... تم اپنے دل کے انجام کی فکر کرو۔'' بہادر خان نے شرما کر کہا۔ اپنا قلم لہرایا کہ لکھوالو۔

وہ مسکرادیا۔ شرارت سے اس کی آنکھیں چمکیں۔ ''لکھو.....'' وہ بولنے لگا۔

خط..... ایک خط..... ایک تمام خط.....

دل کا حال تھام کر..... زبان کا حال خط.....

☆.....☆.....☆

خط لکھ چکنے کے بعد وہ حیرت سے شمس کو دیکھنے لگا۔ ''یہ خط ہے؟''

وہ مشکل سے اپنا قہقہہ دبا سکا۔ ''بالکل..... ایک خط..... بہت اہم خط.....'' سنجیدگی سے بتایا۔

''میں چند عدد سفید بالوں کا مالک ہوں اتنا تجربہ ہے میرا، ایسا خط دام دے کر کبھی کسی نے نہیں لکھوایا۔''

اس نے اگلا قہقہہ روکا۔ ''میں دام دیتا ہوں تم اسے پہنچا بھی دینا۔''

اس نے خوشی خوشی عطر کی چند بوندیں خط پر چھڑکیں۔ خط مہر بند کیا۔ ''کیوں نہیں..... کیوں نہیں..... محلّہ اور حدود اربعہ بتادو۔ ابا کے گھر سے باہر رہنے کے اوقات بھی۔ اس کی کوئی ملازمہ ہوگی اس کا بھی بتادو۔'' سرگوشی میں پوچھا۔

''برا نہ ماننا یہ کچھ کوچوں میں کام نہیں کر سکتا۔ کوچہ پہلواناں، کوچہ ہتھیاراں، کوچہ بدتہذیباں اور کوچہ آدم خوراں۔ کوچہ جان بچا کر بھاگنا میں بھی..... ان کوچوں میں اسے دیکھتے ہی لوگ اپنی آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔'' ہمسائے نے پھر مداخلت کی۔ وہ جانتا تھا اب سرگوشی میں کیا کہا گیا ہوگا۔

''تمہیں سب سے محفوظ راستہ بتاتا ہوں محبوب جان! وہ اکثر اپنی سواری پر ہوا خوری کے لیے نکلتی ہے..... تو تم.....''

''وکٹوریہ..... تم وکٹوریہ کی بات کرتے ہو.....'' محبوب جان کی خوشی کافور ہوگئی۔

اس نے شرارت سے ہونٹ بھینچ کر سر ہلا دیا کہ ہاں۔

''لاؤ خط کی لکھائی کے دام دو، دوسری خدمت کے لیے معذرت عزیزم!''

اس نے خفا خفا نظروں سے محبوب جان کو دیکھا۔ ایک نظر رحل پر رکھے عطر معطر خط پر ڈالی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس پر دو سکے رکھ دیے پھر تین، پھر چار..... پھر چھ..... محبوب جان کن اکھیوں سے دیکھتا رہا۔ خط لکھائی کے دام اُٹھا لیے باقی وہیں چھوڑ دیے۔ کتنا مشکل تھا باقی سکے چھوڑ دینا۔ اس پر سکے پر سکے گرتے رہے۔ اس نے تھوک نگلا۔

''ہاتھ روک لو جوان! ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اس نے لڑکیوں کی طرح منہ موڑ لیا کہ دام پر نظر نہ پڑے۔ وہ لالچ نہ کر جائے۔ وہ انگلی اور انگوٹھے سے ہوا میں اچھال کر سکے پر سکے گراتا رہا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ ہمسایہ دکان دار دلچسپی

سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سکوں کی آواز کا شور پر ساز تھا۔ کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ محبوب جان کن اکھیوں سے دام پر دام بڑھتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سر جھکا کر سکوں کو غور سے دیکھا۔ کافی ڈھیر لگ گیا تھا۔ اور پھر انہیں جلدی سے اٹھا کر صندوقچی میں رکھ لیا۔

''آپ اتنی ضد کرتے ہیں تو اپنی ''جان'' کا نذرانہ پیش کر دیتا ہوں..... آہ.....''

جان کا نذرانہ پیش کرنے محبوب جان کئی دنوں سے وکٹوریہ کے انتظار میں روشنائی دروازے کے آس پاس بھٹکتا رہا تھا۔ ایک شام اسے وکٹوریہ دکھائی دے گئی، وہ اس سے مخالف سمت الٹے پیروں بھاگنا چاہتا ہے لیکن زبان بھی کوئی چیز ہے، جب دے دی تو پھر..... دینی ہی پڑے گی..... جان..... اس نے کپڑے سے اپنا منہ اچھی طرح لپیٹ لیا۔ سنا ہے کہ مشہور ڈاکو ایسے منہ سر لپیٹتے ہیں۔ خط پہنچا کر آنے کے لیے کچھ خاص کپڑے تھے تا کہ بعد میں پہچانیں نہ جائیں، وہ پہن لیے تھے۔ وکٹوریہ ہوا سے باتیں کرتی وہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ کافی دیر بھاگا بھاگی ہوتی رہی۔ کوچوان کو احساس ہوا تو رفتار دھیمی کی کہ نہ جانے کیا افتاد مچی ہے یہ کون پیچھے آ رہا ہے۔ لٹک پھٹک کر، اپنی جان پر کھیل کر، دھول مٹی ہو کر محبوب جان نے ہانپتے کانپتے وکٹوریہ کی کھڑکی پر دستک دی۔ جیسے ہی کھڑکی کھلی اس نے خط اندر پھینکا اور تیزی سے بکٹ بھاگ گیا۔ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اس کی بھاگا دوڑی دیکھ کر کوچوان ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

جسے اندر خط ملا تھا اس نے کھڑکی سے سر نکال کر دھول میں بھاگتے ایک طوفان کو دیکھا۔ اس کا بھاگنا ایسا تھا کہ اسے غصے کی بجائے ہنسی آ گئی۔ ''کیا عجب تماشا ہے۔'' پیروں میں گرے رقعے کو دیکھا۔

''عجب ہنگام خان ہے۔'' محبوب جان کو گرتے پڑتے بھاگتے دیکھ کر شمس ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ وہ پل پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بے چارے نے سانس تک نہیں لیا تھا بس اپنی جان کی امان پائی تھی۔

جس نے خط کی جان پائی تھی وہ دانت پیس رہی تھی، لکھا تھا۔

''سلام اے آفت و پرکالا! مصیبت و نالہ! طوفان و باد و باراں! سلام اے اذیت ناک گھڑی! گرہن کی چاندنی۔ زبان انگارہ، مزاج شرارہ۔ جوابی خط بھیجنے کی زحمت نہ کرنا تم تک زبان خلق کا سلام پہنچانا ہی مقصود تھا۔''

اس نے خط پڑھا..... تمام پڑھا..... خط کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ کوچوان کی طرف کی کھڑکی میں چلا کر کہا۔ ''واپس چلو۔'' یہ واحد خط تھا جسے اس نے پرزے پرزے نہیں کیا تھا بلکہ ثبوت کے طور پر سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ ایک خاص ملازم کو بلا کر دکھایا۔ وہ خط کھول کر دیکھتا اس سے پہلے سونگھ کر ہی جان گیا۔ ''محبوب جان.....''

''وہ کون ہے؟''

''مشہور خط نویس ہے۔ کوچہ دیواناں جسے وہ شارع حب کہتا ہے کے چوبارے پر بیٹھتا ہے۔''

شارع حب.....کوچہ دیواناں.....کوچہ یاراں.....

وہ عجیب نظروں سے ملازم کو دیکھنے لگی۔ ''یہ تم مجھے کس زمین کی باتیں سنا رہے ہو۔''

''اپنی زمین اپنے شہر کی باتیں بی بی! کہتے ہیں وہاں ایک دیوانہ رہتا تھا رات دن کوئی ترانہ گنگنایا کرتا تھا۔''

''ہونہہ! کیا بے پر کی اڑاتے ہو۔ عجب! محبوب جان کو حویلی لے آؤ کہنا کچھ ضروری خطوط لکھوانے ہیں۔''

محبوب جان کو آج تک مار بہت پڑی تھی لیکن اتنی عزت سے پیادے بھیج کر خط نویسی کے پیغام نہیں ملے تھے۔ جیسے جیسے وہ روشنائی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا دل حلق میں کھینچا چلا آتا تھا۔ حویلی کی ڈیوڑھی سے نکل کر احاطے میں وکٹوریہ دیکھ کر رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔ ''چلو محبوب جان! اب دنیا سے رخصتی کا وقت آیا جاتا ہے۔ اب تک دل ملاتے رہے ہو اب فرشتہ اجل سے ملو۔''

اس نے اماں سے کہا کہ فرنگی کو ایک خط لکھوانا ہے تو محبوب جان کو بلوایا ہے۔

''غیر مرد سے لکھواؤ گی.....''

''حال احوال ہی لکھوانا ہے سنا ہے ان کا خط بہت اچھا ہے دل موہ لیتا ہے۔'' اس نے لفظ چبائے۔

دل موہ لینے والے کا دل سینے میں پھڑ پھڑاتا تھا۔ وہ نیچے غالیچے پر براجمان تھا یہ تخت پر سوار تھی۔ خط کھول کر لہرایا۔

''یہ تم نے لکھا ہے؟''

اس نے تھوک نگلا۔ ''دکھائی تو کچھ ایسا ہی دیتا ہے۔''

''اگر ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تو بینائی ٹپکا دوں آنکھوں میں۔ کفایت تیل گرم کرلانا۔''

''ہاں آں! یہ میرا ہی لکھا لگتا ہے۔ پر ہم غریب لوگ ہیں، ماں بیمار، بیوی لاچار، ابا عدم سدھار! اولاد نا ہجاز..... مم..... میں..... جو کہا جائے وہ لکھنے پر پابند ہوتا ہوں۔ پیٹ سے دشمنی کریں گے تو زندہ کیسے رہیں گے۔''

''کس نے لکھوایا ہے؟'' اس کے بڑھے ہوئے پیٹ کو نظر انداز کیا۔

اس کی سانس میں سانس آئی۔ ''مسافر تھا شاید! جانتا نہیں کون تھا۔ میرا روزگار ہے کوئی آئے لکھوائے۔'' پھر صفائی دی۔

''ہوں! کیا کوئی گنوار تھا؟''

''گنوار تو نہیں.....'' اس نے چند لمحے سوچا۔ ''کسی اونچے گھرانے کا چراغ لگتا تھا۔ اچھا خوبصورت نوجوان تھا۔''

''تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں بھی اچھا خوبصورت نوجوان..... مطلب انسان ہوں۔ خوش جمال، خوش کلام، خوش خطاط۔''

چراغ نے منہ بنایا کہ ان جناب کی خوبصورتی کی یہ تعریف ہے۔

''امام صاحب کے بیٹے کی بہت شہرت رہی ہے دیکھا ہے اسے؟''

اس نے آنکھیں چندھیا لیں۔ ''نام بہت سنا ہے دیکھا بھی ہے..... وہ..... وہ نہیں ہے.....''

''بہتر! جوابی خط لکھو۔''

اس نے خط لکھوانا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ خط لکھنے والے کو پان کی خاص گلوریاں کھلائی جاتی رہیں۔ جو وہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے منہ بگاڑے بغیر اندر اتارتا رہا۔ جلدی نگل لیتا تھا تو اگلی گلوری مل جاتی تھی۔ زیادہ دیر تک چباتا تھا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اس پان کو جس بھی ترکیب پر بنایا گیا تھا، وہ ترکیب رات تک اس کا کام تمام کر دینے والی تھی۔ محبوب جان اپنی جان بال بال بچا کر حویلی سے نکلا۔

''اگر کوئی مجھے آفت و نالہ کہے تو مجھے اس کا کیا حال کرنا چاہیے؟'' رات کو وہ حور سے پوچھ رہی تھی۔

''اشرفیوں سے اس کا منہ بھر دینا چاہیے۔ ایسا سچ بولنے کی جرأت آخر کی کس نے؟'' حور نے دانت نکالے۔

چور نے.....

☆.....☆.....☆

''تم امام صاحب کے بیٹے ہو؟'' اگلے دن وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

آنکھ کی کمان شرارت سے مسلی۔ ''تمہیں کیا لگتا ہوں؟''

''دیوانے.....'' سنجیدگی سے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ ''آں..... نہیں.....''

''بہتر! یہ لو تمہارے نام خط آیا ہے۔ میں ایسے ہی ڈر رہا تھا آئندہ بھی میری خدمات درپیش ہوں تو میں حاضر ہوں۔''

''اور کوئی زبانی پیغام.....؟'' وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

''جان کی امان پاؤ اور شہر سے غائب ہو جاؤ۔''

''اس نے کہا.....'' خط کو لہرا کر پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں۔''

''تمہاری کہاں سنے گا۔'' اس نے شرارت سے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ محبوب جان نے گہری آہ بھری اور،

''جوانی بیتانے کے دنوں میں جان کیوں گنواتے ہو۔''

''جاں دارایم..... جاں درایم..... یوں کہیں کہ جان دی ہے.....''اس نے قہقہہ لگایا۔

''اس میں مسکرانے والے کیابات ہے۔اپنی جان کی خیر پاؤوہ کچھ پاگل لگتی ہے۔''

''تم نے مجھے دیوانہ کہااسے پاگل..... بری بات.....''

''بری طرح سے پٹوائے گی۔میرا تجربہ ہےاس شہر کا بہت سوں کے ہاتھ پیرٹوٹتے دیکھا ہے۔''

''میرادل ٹوٹے گا۔''وہ سنجیدہ تھا۔آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''دل کے ٹوٹنے کی پرواہ کسے ہوتی ہے۔میرا کئی سو بار ٹوٹ چکا ہے۔کتنے خط لکھے پر خطاء ہے جواس نے جواب دیا ہو۔''

''تم نے کہا تھا تمہارے لکھے میں بہت اثر ہوتا ہے۔''

''جو کچھ تم نے لکھوایا تھا میں اس کے اثرات سے جان بچا کر نکلا ہوں۔''منہ بسور کر کہا۔

''اس نے تمہیں اجرت دی؟''

''ہاں دی.....میری جان بخشی کر دی،ایسا ایسا پان کھلایا ہے کہ سمجھ نہیں آتی کہ میں بہادر خان ہوں یا پانی کا کوئی جانور۔''

بے ساختہ قہقہہ اور وہ ہنستا ہی رہا۔ہاتھ کی مٹھی میں خط دبا ہے۔سامنے دیوار پر چاک سے ''شارع حب'' لکھا ہے۔اس پر دھوپ کی ایک لکیر پڑتی ہے۔وہ اس لکیر میں کھڑا ہے۔اس نے خط کھول کر آنکھوں کے سامنے بلند کیا۔چراغ چراغ خط سر راہ آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا۔دھوپ خط سے چھن کر ''حب'' پر گرنے لگی۔

خط کی بات.....خط کا ذکر.....

چور کا سوال.....چراغ کا جواب.....

محبوب جان نے تھوک نگلا۔جبکہ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔اس کی پشت سے تین ہاتھی آگے پیچھے آتے دکھائی دیے۔محبوب جان عجلت میں اٹھا،جلدی سے اپنے سامان پر کپڑا ڈال دیا۔ایسے ناہجاز ہاتھی تھے یہیں کہیں خانہ خراب کر دیتے تھے،بدبو الگ آتی،چھینٹے الگ اٹھتیں۔کل کچھ بارش کا سلسلہ بھی رہا تھا۔اس کا جی اُمڈ آیا۔مہابت ہاتھی کی پشت پر بیٹھا چھڑی لہراتا ترنگ میں گا رہا تھا۔

اے چور تو اپنا نام بتلا.....

چوری کا سبب تمام بتلا.....

"شمس امیری....." چور نے مہابت کی طرف سر اٹھا کر اپنا نام بتلایا۔ وہ ہاتھیوں کے ہجوم میں گھر گیا۔ ہاتھی آگے پیچھے دائیں بائیں سے گزر رہے تھے۔ وہ عین ان کے درمیان گھرا کھڑا ہے۔ گل بکاؤلی کا ساز بازار میں گونجتا رہا۔ مہابت چور چور گاتا رہا، اور

خط چور کے ہاتھ میں بلند رہا.....

جان دارایم..... جان درایم.....

یوں کہیں کہ جان..... جان.....

☆.....☆.....☆

خط پوش..... ماہ روش..... دل رو.....

خط اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ وہ اپنے ابا جی کی مسجد کی سمت قدم بڑھا رہا تھا۔ مسجد کے صحن میں پہنچ کر رک گیا۔ ابا جی کا پوچھا، وہ مسجد کے کتب خانے میں تھے۔ کھڑکی کے رخ پر کھڑے منطق الطیر کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ کسی خاص سطر کی تلاش میں تھے شاید۔ وہ پیچھے سے گیا اور کندھوں پر دوستانہ انداز میں بازو پھیلا دیے۔ اتنی بے تکلفی سے پہلی بار ان کے قریب ہوا تھا۔ کتنا خوش ہوئے وہ۔ کتنا حیران ہوئے وہ۔

"مجھے آپ سے ایک کام ہے ابا جی!"

"سو کام باپ کی جان....." مسکرا کر اس کی سمت سیدھے ہوئے۔

☆.....☆.....☆

"کیا لکھا تھا خط میں ہماری سلام دعا بھی لکھ دی تھی۔" اماں خوش تھیں کہ اس نے فرہاد کو خط لکھا ہے۔

"سب کے سلام لکھ دیے ہیں اب جواب کا انتظار ہے۔" آنکھیں سکیڑ لیں۔

جواب حاضر ہی ہوا جاتا ہے لیکن ذرا ٹھہر جاتے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کرتے ہیں، کہانی میں اس کا ذکر ذرا وقفے سے لاتے ہیں۔

اماں نے ٹھٹک کر دیکھا۔ جس طرح آنکھیں سکیڑ کر اس نے کہا تھا لگتا تھا پھر کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

"تمہاری نسبت طے ہے فرہاد سے چراغ! اگر کچھ ایسا ویسا لکھا ہوا تو یاد رکھنا....."

"ہر وقت کچھ نہ کچھ یاد کرواتی رہتی ہیں کچھ نہیں لکھا اس فرنگی کو۔" وہ چڑ گئی۔

''جن کے ساتھ نسبت طے ہو ان کا نام سن سن کر لڑکیاں شرماتی ہیں، ایک یہ ہے آنکھیں پھیر لیتی ہے، منہ بنا لیتی ہے۔'' اماں نے چچی سے اپنا دکھ کہا۔

''وہ کون سا غیر ہے جانتا ہے اسے۔'' چچی نے تصور میں چراغ کو شرماتے ہوئے دیکھا اور ہنس دیں۔

''جان بوجھ کا یہ مطلب ہوا کہ اس سے ایسا سلوک کرے۔''

''شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی بھابھی!''

''یا خود ٹھیک ہو جائے گی یا اسے کر دے گی۔ میری حسرت ہی ہے کہ یہ تمیز تہذیب سے ڈولی میں بیٹھ جائے۔ عجیب عجیب تصور آتے ہیں کہ یہ دلہن بنی کوئی ہنگامہ کر رہی ہے۔ گھونگھٹ الٹ کر اپنی وکٹوریہ لے کر دریا کی طرف بھاگ رہی ہے۔'' اماں نے معصومیت سے بتایا۔ ''ایک دن خواب دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور یہ نامعلوم کس کا سر قلم کر دینے کے سر پر ہے۔ آنکھیں خون رنگ ہیں۔ زمین پر بھی خون ہی خون ہے۔'' چچی افروز ہنستی رہیں۔ اماں نے معصومیت سے چچی کی طرف دیکھا۔

''افروز! کہہ دو یہ میرے شعور کی کارستانی ہے، خواب جھوٹا ہے.....''

''خواب ملغوبہ ہے بھابھی! آپ کی سوچوں کا پکوان ہے۔''

''میری لاڈلی بہن کی زندگی خوار نہ کر دے ہماری چراغ۔'' اماں بڑبڑائیں۔

''وہ آپ سے زیادہ اس کے لاڈ اٹھاتی ہیں۔ چراغ نے خط لکھ کر کوئی شکایت کر دی تو بھاگی آئیں گی۔''

''مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ اس نے سب کو کیا کھلا دیا ہے کہ سب اس پر جان نچھاور کرتے پھرتے ہیں۔''

''کھلانے پلانے سے محبت کہاں بڑھتی ہیں یہ تو نصیب ہی کے کمال کی تحریر لگتی ہے۔''

چچی کی نظر مہتاب کی طرف اُٹھ گئی۔ عید کا چاند کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دے جاتا تھا، شوہر وہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دونوں بیٹے بیرام کے ساتھ رہتے تھے۔ جتنا حسن تھا اس پر اتنا ہی سوگ طاری رہتا تھا۔ اماں نے چچی کی نظر کے تعاقب میں دیکھا۔ خود بھی گہرا سانس بھر کر رہ گئیں۔ بہن پر جان دینے والا بیوی سے کنارا رکھتا تھا۔ بیوی تھی کہ دل کو لگتی ہی نہیں تھی۔ نہ جانے کون دل کو لگ گیا تھا کہ ساری دنیا کو دل نے ٹھکرا دیا تھا۔

یہ دل..... یہ من مانی کرنے والا دل.....

☆.....☆.....☆

دل کی افتاد سے بے خبر شمس دریا کے کنارے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اس دریا کے کنارے جہاں دس بڑے راجاؤں کی

جنگ لڑی جا چکی تھی۔ چاند اس کے پانی میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ شہر کے دروازے بند ہو جانے کو تھے۔ لیکن اس جیسے کچھ جوان کنارے کنارے ٹہلتے باتیں کر رہے تھے۔ یہ رات بھر جاگیں گے۔ روشنائی دروازے کی روشنیاں چکا چوند تھیں۔ اس کی نظریں بار بار اس طرف اٹھتی تھیں۔ عجیب شہر ہے، ایک طرف پانی کا دریا بہتا ہے، دوسری طرف آگ کا۔

چراغ کا..... چراغوں کا.....

"وہ دروازہ دکھائی دے رہا ہے، جس دن میں پیدا ہوئی تھی اس رات یہاں ہر طرف چراغاں کیا گیا تھا۔ اسی لیے اسے روشنائی دروازہ کہتے ہیں۔"

وہ ہونق اس کی شکل دیکھ رہا تھا کہ مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ اپنی حیثیت پر کوئی ردعمل نہ پا کر وہ بھنا گئی۔ پیر پٹختی سواری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ چراغاں چراغاں..... چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنجھلا کر چلتی تھی۔ ہوا کو پرشور کرتی تھی۔ دریا کا پانی تک چھن چھن تھا۔ نہ جانے یہ بات اسے اس پہر کیوں یاد آئی۔ اسے ایسی خراب باتیں اور لوگ یاد نہیں کرنے چاہیے۔ لیکن بری باتوں کی ایک عادت ہوتی ہے رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔ وہ برے سے روشنائی دروازے کو گھور رہا تھا۔ دروازے کے پہرے داروں کا کہنا تھا کہ یہ دروازہ ہمیشہ سے روشن رہا تھا۔ یہاں قلعے کے جان نثار، بادشاہ کے وفادار رہتے تھے۔ ان کے محلوں میں بڑے بڑے چراغ روشن کیے جاتے تھے، اس لیے اس کا نام روشنائی دروازہ ہو گیا۔ یہ دروازہ اصل میں قلعہ کا دروازہ ہے، جو اپنی ہیت کے اعتبار سے قدیم ترین ہے۔ کسی کے پیدا ہونے نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کبھی کہیں جھوٹ بولنے سے لوگوں کی شکل بدل جایا کرتی تھیں اب تو زبان کا ذائقہ بھی نہیں بدلتا۔ جان دے کر خریدا جانے والا شہر جھوٹ بول کر اپنے نام لگوایا جا رہا تھا۔

باغ کی طرف اس جیسے جوانوں کا بکھرا سمٹا ہجوم تھا۔ یہ جوان لوگ رات رات بھر کیوں جاگتے ہیں۔ وہ کیا ہے جوان کی نیندیں اڑا دیتا ہے۔ یہ کس سلسلے میں آہیں بھرتے شعر سنتے کہتے ہیں۔ دو لڑکے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک نے سر پر دوپٹہ لیا ہوا ہے۔ یہ لڑکی بنا ہوا ہے۔ لڑکی جو مہر النساء ہے۔ ایک اس کے قریب سر پر شاہی ٹوپی پہنے کھڑا ہے۔ یہ شہزادہ جہانگیر ہے۔ یہ مہر النساء کو کاغذ سے بنے کبوتر پکڑا کر تیسرے کبوتر کی طرف بھاگ رہا ہے۔ قصہ گو ساتھ ساتھ کہانی سنا رہا ہے۔ مہر النساء ہاتھ میں پکڑے کبوتروں سے لاڈ کر رہی ہے۔ شہزادہ فرضی کبوتر کے پیچھے بھاگتے بھاگتے کسی شے سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ دیکھنے والوں کا ہجوم ہنسنے لگا۔ کبوتر پکڑ کر واپس آیا۔ مہر النساء کے ہاتھ میں دو کی بجائے ایک کبوتر دیکھا۔

"یہ کیا..... دوسرا کبوتر کہاں گیا؟"

"اڑ گیا....." معصومیت سے بتایا۔

''اُڑ گیا..... کیسے؟'' حیرانی، طیش، خفگی۔

''ایسے.....'' ہاتھ میں پکڑا دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔

''کبوتر پھر اُڑ گیا، شہزادے کا دل مہر النساء میں رہ گیا۔'' قصہ گو نے ہاتھ لہرا کر لہک کر کہا۔ دیکھنے والوں نے واہ واہ کیا۔

''پر یہ مہر النساء کی مونچھیں کیوں ہیں؟'' کسی نے ہانک لگائی۔ شمس دلچسپی سے دیکھ رہا تھا بے ساختہ ہنس دیا۔

''مہر النساء بننے کے لیے آپ اپنی مونچھیں صاف کروانا پسند کریں گے۔'' قصہ گو نے چڑ کر پوچھا۔

''میں شہزادہ ہوں وہی بنوں گا، مہر النساء کو بیوہ کر کے اسے نور جہاں نہیں بناؤں گا۔''

''یہ سراسر خرافات ہے۔ الزام ہے جہانگیر پر۔ محبت کی داستانیں جھوٹ پر لازوال نہیں ہوتیں۔ اگر ہو جائیں تو پھر ان میں محبت کی سچائی ضرور شامل ہوتی ہے۔ وقت جھوٹ سچ کے سب پردے چاک کر دیتا ہے۔ جہانگیر کے مرنے کے بعد ملکہ نے گوشہ نشینی اور تنہائی میں گزارے۔ خوشی کی تقریبات میں اپنی مرضی سے شرکت نہیں کی۔ جہانگیر پر الزام نہ لگاؤ۔ نور جہاں کو بدنام نہ کرو۔ ان دونوں کی محبت کے قصے سارے جھوٹے نکلے تب بھی بہت سا سچ ضرور نکلے گا۔''

''اچھی سچی محبت تھی کہ قتل و غارت چالبازیوں کا دربار گرم رہتا تھا۔''

''خون بہا محبت کے دام ہیں..... کیوں صاحبوں؟'' اس نے سب سے پوچھا۔

صاحبوں نے سر ہلا دیا۔ ''دنیا میں بہت سی چیزوں کے لیے جان لی جاتی ہے، مال و دولت، تخت و تاج، طاقت و حشمت، لیکن صرف ایک چیز ہے جس کے بدلے میں جان دی جاتی ہے اور وہ ہے ''محبت''۔ محبت ہی جانثاری ہے، محبت ہی قدر دانی ہے۔'' کسی نے کہا۔

''یہ شہر جتنی محبت کی بات کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت سے دور بھاگتا ہے۔'' شمس نے شانے اچکا کر کہا۔

''یہ آپ نے کیسے کہہ دیا عزیزم۔'' قصہ گو نے شمس کی طرف رخ کیا۔

''جسے دیکھو وہ جان لینے کے درپے ہے۔'' وہ ایک شہر والی کی بات کر رہا تھا اور بات سارے شہر کو سنا رہا تھا۔

''کوئی نادان ہو گا۔ تم خوبصورت نوجوان ہو، شہزادے لگتے ہو جہانگیر بنو گے؟'' شمس سے پوچھ رہا تھا۔

''میں..... پر میں تو شمس امیری ہوں.....''

''شمس امیری؟ شمس لیا تھا تو تبریز لینے میں کیا اجرت تھی..... کیا دام نہیں تھے؟''

اف شہر والوں کی زبان۔ ''میں شمس تبریز امیری ہوں..... اب ٹھیک ہے؟'' وہ چڑ گیا۔

''اب اور خراب ہو گیا۔ تبریز والوں نے سن لیا تو خفا ہوں گے، پکڑ کر مار بھی سکتے ہیں۔ جواب دو جہانگیر بنو گے؟''

جو تبریز نہیں تھا اس نے جہانگیر بننے کے لیے ہجوم کی طرف سر گھما کر دیکھا۔ ہجوم نے شور ڈال دیا۔ وہ جہانگیر کی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ مہر النساء بھی بدل دی گئی۔ بغیر مونچھوں والی۔ اس کا آنچل سر سے ہو کر زمین کو چھوتا تھا۔ وہ شرمانے کی انتہائی شرمناک، خوفناک سی حرکت کرتی تھی۔

''میں اس نور جہاں کو اپنے کبوتر نہیں دوں گا۔''

''کیوں یہ کبوتر لے کر بھاگ جائے گی؟''

''نہیں یہ کبوتر کھا جائے گی.....''

ہجوم محظوظ ہوا۔ ہنستے ہنستے بے حال ہوا۔

''تم شہزادے ہو مسخرے نہیں، ایسی زبان شہزادوں کو زیب نہیں دیتی۔ شاباش! اپنا مقام پہچانو اور شروع ہو جاؤ۔''

شہزادہ شروع ہو گیا۔ کچھ دُور سے چلتا ہوا آیا۔ ہاتھ میں دو کبوتر تھے۔ اُڑ چکے کبوتر پر نظر تھی۔ مہر النساء حوض کے پانی پر جھکی اپنا عکس دیکھ دیکھ کر اٹھلا رہی تھی۔ شہزادے کو کبوتر کی کتنی فکر تھی، اس کی نظر آسمان سے اترتی نہ تھی۔ مہر النساء کو پانی کی جھلمل سے کیسی دلکشی تھی۔ اس کی نظر پانی سے اوپر نہ تھی۔ وہ قریب سے گزرا تو ٹکرا گیا۔ چونک کر لیکن بے توجہی سے دیکھا۔

''اتنی فراغت ٹھیک نہیں.....'' شہزادے شمس نے استہزائی جتایا۔

''لیکن اتنی ٹھیک ہے؟'' جل کر کبوتروں کی طرف اشارہ کیا۔ کہ تم کرو تو شہزادے ہم کریں تو فارغ البال۔ کمال۔

''شہزادوں کو ہر کام زیب دیتا ہے۔''

''کام نہیں مشغلہ.....'' طنزیہ ہنسی۔

جھٹکے سے کبوتر مہر النساء کے ہاتھ میں تھمائے۔ ''انہیں پکڑ کر رکھنا میں دوسرا لے کر آیا۔''

شہزادہ اُڑ چکے کبوتر کے پیچھے گیا۔ واپس آیا تو مہر النساء کے ہاتھ میں صرف ایک کبوتر تھا۔ وہ بھنا گیا۔

''جتنی تمہاری زبان چلتی ہے عقل کیوں نہیں چلتی۔''

''نہیں..... نہیں..... جہانگیر نے یہ نہیں کہا تھا..... جہانگیر یہ نہیں کہہ سکتا۔'' ہجوم کا شور بلند ہوا۔

''جہانگیر میں ہوں یا آپ، مجھے میرا کام کرنے دیں۔'' اس نے ہجوم کی طرف گردن گھما کر جتایا۔

''جواب دو کم عقل..... تمہاری عقل کام کیوں نہیں کرتی.....'' واپس مہر النساء کی طرف متوجہ ہوا۔

''اگر آپ کی کام کرتی ہوتی تو کبوتر نہ پکڑتے پھرتے۔'' آنچل سنبھالتی مہر النساء بھی کیوں پیچھے رہتی۔

''میرا کبوتر کہاں گیا؟''

''آپ کا کبوتر..... آپ کبوتر کے والد محترم ہیں؟''

''اسی محل کے تہہ خانے میں ایک قید خانہ ہے وہاں ایک زندہ شیر رہتا ہے۔تم سے پہلے تمہاری زبان کو اس کے سامنے پھینکا جائے گا۔'' جہانگیر نے شمس کا بدلہ لیا۔ہجوم چپ،ہجوم محظوظ۔وہ بھی چاہتے تھے کہ بدزبان مہر النساء کو سزا ملے،سمجھتی کیا ہے خود کو۔

''میری زبان شیر کے سامنے پھینک دو گے..... اپنا دل کہاں پھینکو گے.....؟''

سناٹا..... خاموشی.....

دور روشنائی دروازے کے پہرے داروں کے جوتوں کا شور بلند ہوا.....

دل پھینک دیا جائے گا۔دل کچل دیا جائے گا۔

''کبوتر کہاں گیا.....''

''اُڑ گیا.....'' مہر النساء نے ادا سے کہا۔معصومیت سے جتایا۔

''کیسے اڑ گیا.....؟'' وہ اس معصوم صورت کو دیکھ کر رہ گیا۔

''ایسے.....'' اس نے ہاتھ بلند کیا۔دوسرے کبوتر کو بھی چھوڑ دیا کہ کیسے۔

کبوتر پھر اڑا..... کبوتر دور آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔شہزادے کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔وہ مہر النساء کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔اس کے تیکھے نقوش پر فدا ہوتا تھا۔وہ حسن والوں کو جانتا تھا،حسین جرأت والوں کو اب جان رہا تھا۔مہر النساء نے بے پناہ حسن سے لبریز ترچھی نظر سے شہزادے کی طرف دیکھا۔وہ تیر کے کئی کش اس سینے پر سہہ سکتا تھا لیکن یہ نظر..... یہ نظر کہ.....

تخت چھوڑ دیا جائے.....

بادشاہت لٹا دی جائے.....

اس ادا پر..... اس کمال پر.....

ہجوم نے داد و تحسین بلند کی۔انہیں یہ نئی مہر النساء اور جہانگیر پسند آئے تھے۔ان کی سخت کلامی بھی اچھی لگی تھی۔اب یہ کیا بات ہوئی کہ جہانگیر معصوم خوار ہوتا رہے۔آخر کسی نے تو مہر النساء کو بھی بتایا کہ کنکر کے جواب میں پتھر بھی آ سکتا ہے۔قصہ گو نے تالی بجا کر ہجوم کو اپنی سمت متوجہ کیا۔''اب فیصلہ کیا جائے کہ مہر النساء نے شہزادے کو زچ کرنے کے لیے کبوتر

جان بوجھ کر اڑا دیا تھا یا نہیں۔"

"کیا جہانگیر زچ ہوا؟" شمس نے سوال پوچھا۔

"اُف! سوال پر سوال نہیں پوچھا کرتے۔"

"جہانگیر کو اس کبوتر والی سے محبت ہوگئی..... کیا یہ اس کی ادا تھی؟" قصہ گو نے اگلا سوال پوچھا۔

"پہلے سوال کا جواب نہ ملے تو دوسرا نہیں پوچھتے۔" شمس نے قصہ گو کو یاد دلایا۔

"ہاں جہانگیر زچ ہوا۔ وہ شہزادہ تھا اسے سب کو حد ادب دیکھنے کی عادت تھی۔ مہرالنساء نے معصومانہ بے ساختگی دکھائی۔ شہزادے کو خوش کرنے کے لیے لوگ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کبوتر کو جان سے لگا کر رکھتے۔ کبوتر اڑا دینے والی اپنی ذات میں پراعتماد اور نڈر تھی۔" شمس کہہ رہا تھا۔ قصہ گو سمیت سب سر ہلا رہے تھے۔

"اس لیے اس نے جہانگیر کے دل اور سلطنت پر بادشاہت کی۔" ہجوم میں سے کسی نے کہا۔

"نڈر انسان اپنی سلطنت کا انتخاب خود کرتا ہے، وہ دل کی ہو یا زمین کی۔" بے ساختہ شمس کے منہ سے نکلا۔

ایک لمحے کے لیے سناٹا ہوا۔ "یہ اب کچھ سنجیدہ باتیں شروع ہو چکی ہیں۔ یہ قصہ گوئی کی جگہ ہے درباری باتوں کی نہیں۔ اب میں وہ قصہ سناتا ہوں کہ نور جہاں نے ہاتھی پر سوار ہو کر کیسے چار شیر مار گرائے۔ ملکہ کا نشانہ بے خطا تھا۔"

"تم اس زمانے میں بھی پائے جاتے تھے۔" اس کے بھاری وجود پر بات رکھ کر کسی نے اسے ہاتھی کہا۔

"ہاتھی خاص جگہوں پر پائے جاتے ہیں البتہ گدھے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ایک بادشاہ کی سواری، ایک بوجھ کی۔"

"بادشاہ بھی زمین کا بوجھ ہی ہیں۔"

"ہر بادشاہ پیدا نہ ہونے والا یہ کہہ کر دل کو تسلی دے سکتا ہے۔" قصہ گو نے متانت سے کہا۔

☆.....☆.....☆

وکٹوریہ اس نے مسجد سے دُور رکوائی تھی۔ کوچوان پر کیا اعتبار کرتی۔ گھوم کر دوسری طرف سے مسجد کے سامنے آئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر کتب خانے کی سمت جانے لگی۔ وہ بچپن میں کئی بار یہاں آچکی تھی۔ ظہر سے پہلے امام صاحب سے دینی مسائل پر بات کی جا سکتی تھی۔ ان کے کتب خانے میں خاص پردے کا انتظام تھا۔ چچی اور اماں بھی آیا کرتی تھیں۔ کبھی کفایت کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر آئی تھی۔ کتب خانہ دکھائی دیا، دروازہ آدھ کھلا تھا۔ کمرے کے وسط میں جعفری کا پردہ تھا۔ اندر سے کسی گھر کی خادمہ نکل رہی تھی۔ ہاتھ میں پرچہ پکڑا تھا۔ اسے دیکھا تو سلام کر کے جلدی سے کچھ بتانا چاہا "وہ امام صاحب ن....." وہ جلدی سے اندر کود گئی کہ جاؤ وقت ضائع نہ کرو، باتوں کا وقت نہیں۔ نشست پر تفاخر

سے بیٹھ گئی۔ جعفری کی دوسری سمت امام صاحب ٹہل رہے تھے۔

''السلام علیکم امام صاحب! میں ایک فریاد لے کر آئی ہوں اگر آپ نے بھی میری مدد نہیں کی تو میں دکھ اور افسوس سے دلبرداشتہ ہو جاؤں گی۔'' فریادی نے آواز نم کر لی۔ ابھی وہ سسکنے لگے گی، پھر روئے گی پھر اس کی ہچکیاں بندھ جائیں گی۔ جب کام بن جائے گا تب جھوٹے آنسو صاف کر لے گی۔

امام صاحب جھٹکے سے جعفری کی سمت متوجہ ہوئے۔ ''وعلیکم السلام'' بڑی مشکل سے کہا جیسے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو۔ یہ امام صاحب اونچے لمبے ہیں۔ ہوا چلے تو بال پیشانی پر گرتے پڑتے ہیں۔ آنکھیں سنجیدہ ہوں تو سہما دیتی ہیں، آنکھیں مسکرا دیں تو دل دھڑکا دیتی ہیں۔ ان کا نام شمس ہے کنیت امیری ہے۔ وہی جس نے شمس چرالیا لیکن تبریز چرانا بھول گیا۔

چرانے والا بے اختیار زیر لب مسکرا دیا۔ ابا جی ابھی کسی کے پیغام پر عجلت میں نکلے تھے۔ اسے ایک کام سے بلوایا تھا۔ وہ وہیں رہ گیا۔ اس سے پہلے ایک لڑکی آئی تھی، اسے ابا جی کی غیر موجودگی کے بارے میں بتایا ہی تھا کہ یہ دوسری والی آ گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ ایک صاف کاغذ بے آواز گول کر کے منہ میں ٹھونس لیا۔ اب وہ آواز کی چوری کرے گا۔

''میں سن رہا ہوں..... فرمایئے.....''

عجیب پھنسی پھنسی آواز اس کے کانوں میں پڑی جس پر اس نے توجہ نہیں دی اور اپنے دُکھ سنانے شروع کر دیے۔

''آپ کو برا لگے گا، آپ کا دل بھی دکھی ہو گا لیکن میں سچ نہ بولوں تو پھر اتنے سارے دکھوں کا بوجھ کیسے اٹھاؤں۔ میری جان عذاب میں ہے۔ میرے اردگرد ایک جان لیوا جال ہے۔''

''کیا آپ کوئی قصہ سنانا چاہتی ہیں۔'' طنزیہ پوچھا۔

وہ بھنا گئی۔ امام صاحب کی حلاوت کی بہت تعریف سنی تھی، شاید بدل گئے۔ ''بہتر! صاف بات کرنا ٹھیک ہے۔ آپ کا بیٹا مجھے بہت تنگ کرتا ہے، چھت پر آتا ہے آوازیں کستا ہے۔ اماں گھر کے مردوں کے غصے سے نالاں ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کے چہیتے کی جان جائے، میں جہاں سے گزروں ہنستا ہے۔ میری ڈولی کا پیچھا کرتا اور میری سواری کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہے۔ کیا یہی شریفوں کا طریقہ ہے؟''

''پھر شریفوں کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟''

وہ حیران ہوئی۔ ''شرافت اور کیا.....''

''شرافت کیسے دکھائی جائے بھلا؟''

''شریف رہ کر۔'' وہ سوال پر حیران تھی۔

''ہوں..... یعنی وہ بے شریف ہے۔''

وہ ضبط نہیں کر سکی۔ ''میرا خیال ہے کہ شریف نہ ہونے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ سنا ہے آپ کا اکلوتا بیٹا ہے پر ایسی اولاد سے تو انسان بے اولاد ہی بھلا۔'' امام صاحب کی اولاد کے منہ پر ہی کہہ دیا۔

''کیا مار دوں اسے.....''

''مار دینا تو چاہیے لیکن آپ پر منحصر ہے۔ آج کا سخت فیصلہ کل کی آسانی لائے گا۔ ابھی اس نے مجھے تنگ کرنا شروع کیا ہے کل اور لڑکیوں کو کرے گا۔ آپ نیک نام مشہور ہے وہ آپ کو بدنام کرے گا۔ آپ شاہی مسجد کے امام وہ ناخلف اولاد۔ پچ پچ۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو..... پچ پچ.....''

ٹھیک ہے سن کر وہ اور شیر ہوئی۔ ''آپ اسے نظروں سے دُور کیوں نہیں کر دیتے۔''

''ایک بار جو دل میں آجائے اسے نظر سے کیسے دُور کیا جائے؟''

''یہ سوال ہے؟''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''ہاں! سوال ہے..... کوئی حل ہے.....''

''میرے پاس تو ایک ہی حل ہوتا ہے پر وہ آپ کو منظور نہیں ہوگا۔'' اس کے پاس ایک ہی خاص حل ہوا کرتا ہے۔

''مجھے منظور ہے.....''

دونوں باپ بیٹا کو منظور ہے کہنے کی عادت ہے۔ اس نے سوچا۔ ''میں یہ نہیں کہتی کہ جان سے ہی جائے پر کڑی سزا ہونی چاہیے، شرفاء کی عزت کو سر بازار اچھالنا، ان پر ہنسنا (ڈولی گرنے پر) کہاں کی تہذیب ہے۔''

''بہتر..... میں اتفاق کرتا ہوں..... اب سزا کیا ہو.....''

وہ سوچنے لگی کہ امام صاحب کتنے سنجیدہ ہیں۔ ''میرے اختیار میں ہو تو جان سے کم سزا نہ ہو۔ جان ہی لوں۔''

جان کے امان کا سناٹا.....

''ایک ہی جان ہے کتنی بار لوگی۔'' وہ پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔

جان لینے والا.....

جان دے دینے والا.....

دونوں آمنے سامنے آ گئے۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔ پھر بھڑک کر نشست سے اٹھی۔ طیش سے ناک پھڑکنے لگی تھی۔

''لے لو جان.....'' سینے پر ہاتھ باندھ کر وہ کیسے مسکرا رہا تھا۔

اس نے لپک کر جعفری کے پیچھے سر گھما کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس طرف کھڑکی کھلی تھی۔ آسمان اور قلعہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پتنگ چور نشست چور بھی تھا۔ باپ کے مقام پر براجمان تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے اس کے ہاتھوں زچ ہو رہی تھی کہ جی چاہا سچ مچ رونے لگے۔ ''کیا یہی تمہارا دستور ہے کہ دوسروں کے راز سنتے ہو۔'' پوری جان سے چلائی۔

''راز یا الزامات وہ بھی تراشے ہوئے.....'' (یہ غیبت کو راز کہتی ہے؟)

کتنی ترکیب سے وہ یہاں آئی تھی۔ عین وقت پر نکلی تھی کہ امام صاحب سے ملاقات ہو جائے گی۔ سب بے کار گیا۔ پاؤں پٹختی باہر نکلی۔ بھاگتی ہوئی احاطے میں آئی۔ مسجد کے سفید گنبد اس کی پشت پر چمک رہے تھے۔ اس کا سفید آنچل، ٹخنوں کو چھوتا لباس اس کے غصے کے طوفان سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ کتب خانے سے نکل کر محرابی دالان میں ٹہلنے لگا۔ وہ سامنے بھاگی جا رہی تھی۔ جس وقت وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی اس وقت وہ محرابی جھروکے میں کھڑا بے اعتنائی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پر تھی اپنے ہی لباس کے کونے سے الجھ کر گر گئی۔ ''غصہ انسان کو اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔'' زیر لب تبصرہ کیا۔ وہ گر چکی، سنبھلنے سے پہلے اس نے سر گھما کر دیکھا کہ کسی نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تو نہیں۔

دیکھ لیا تھا..... شاہی مسجد کی ساری شہنشاہی لیے، محراب میں کھڑے شمس امیری نے۔ ستون کے ساتھ شانہ ٹکا کر کھڑا تھا۔ وہ منہ پھیر کر ہنسنا چاہتا تھا پر وہ سامنے سے ہنس دیا۔ وہی شریفوں کے گرنے پر سر بازار ہنسنا۔ وہ ڈرتا کیوں آخر اپنے ابا جی کی مسجد میں کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

گرنا ایک ایسی مصیبت ہے کہ خواب میں بھی گروں تو کوئی نہ کوئی ضرور دیکھ لیتا ہے۔ گرنے سے اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی لیکن جو زخم عزت نفس پر پڑا تھا وہ تکلیف دہ تھا۔ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر دالان میں ٹہل رہی تھی۔ بڑبڑا رہی تھی۔ کبھی کبھار لنگڑا جاتی تھی۔

''کیا وجہ ہے کہ تمہارے اس پاؤں پر بار بار زخم لگتے ہیں۔'' اسی کا ذکر کیا جس سے شمس کا ہاتھ مسلا تھا۔

''زخم ہے کہیں بھی مل جائے۔'' اسے اس زخم پر بھی غصہ تھا۔

''ہاں جیسے دماغ پر.....'' حور نے دانت نکالے، آنکھیں گھمائیں۔

اس کے دل و دماغ کو زخم پہنچانے والا ابا جی کی رحل کے سامنے بیٹھا ایک خط لکھ رہا ہے۔ لکھتے ہوئے مسکرا رہا ہے۔ پھر ابا جی کی مہر اٹھا کر نیچے کنارے پر لگا رہا ہے۔ یہ بہت اہم مہر ہے۔ خیر اس نے بھی خاصی اہم جگہ لگائی ہے۔

خط..... ایک اور خط..... مہر ثبت خط.....

کفایت کو ملازم نے ایک مہر بند کاغذ لا کر دیا کہ امام صاحب کے گھر سے بھیجا گیا ہے۔ پیغام ہاتھ میں دبا کر وہ نشست گاہ میں اماں کے پاس پہنچی۔

''کیا ہے کفایت.....''

''آپ نے مسجد کوئی پیغام بھجوایا تھا اسی کا جواب آیا ہے شاید۔'' کفایت نے رقعہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھا۔ اماں اسے ہی پڑھنے کے لیے کہتیں یا پھر افروز کو۔ ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ چراغ کی آنکھ پھڑکی۔ وہ کودتی پھلانگتی کفایت کے سر پر پہنچی۔ پیغام جھپٹ لیا۔ کفایت ڈر کر بدکی۔ اماں چچی سب حیران اسے دیکھنے لگیں۔

''یہ کیا بات ہوئی چراغ بی بی!'' کفایت نے اماں کی طرف شکایت سے دیکھا۔

''کتنی بار کہا ہے مجھے بی بی نہ کہا کرو، یہ بی بی کرتی زبان کاٹ دوں گی۔'' وہ مسجد سے آئے پیغام سے توجہ ہٹانا چاہتی تھی۔

''آپ کا ارادہ گردن کاٹنے والا لگتا ہے۔'' اس کی عجلت کی طرف اشارہ کیا۔

''واپس دو کفایت کو.....'' اماں کی توجہ ہٹنے والی نہیں تھی۔

''یہ میرا ہے..... میں نے مسجد ایک پیغام بھجوایا تھا اسی کا جواب آیا ہے۔''

اس کی بات جائز تھی لیکن چراغ کی آنکھ کا بال کہتا تھا کہ دال، مطلب چراغ میں ضرور کچھ کالا ہے۔

''کیا مسئلہ تھا.....'' اماں کو شک ہو چکا تھا۔

''وہ مسئلہ..... میرے دل پر گھبراہٹ رہتی ہے..... تو.....''

''کس کا خون پینا چاہیے کہ دل کی گھبراہٹ جاتی رہے۔'' کفایت نے فقرہ مکمل کیا۔

''بول چکو کون سا مسئلہ بجھوایا تھا۔''

''مسئلہ نہیں..... خواب.....'' مسئلہ نہیں سوجھا تو خواب پر ڈالا۔

''کیا خواب تھا.....'' اماں بھی جان نہیں چھوڑنے والی تھیں۔

''کسی کو خواب نہیں بتاتے۔'' اپنے مطلب کی بات، اپنے مطلب کے حل۔

''کفایت پیغام لو اس سے، مجھے دو میں پڑھتی ہوں کہ خواب کی تعبیر کیا نکلی۔''

کفایت نے مسکرا کر ہاتھ پھیلایا کہ اپنے خواب کی تعبیر مجھے دیجئے..... یہاں میری ہتھیلی پر رکھ دیجئے۔

''بہتر! میں تعبیر سناتی ہوں۔'' اس نے پیغام کھول کر آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا۔ تحریر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں، ہونٹ بھینچ گئے۔ چچی نے دیکھ لیا۔ خط میں خواب کی تعبیر نہیں اس کے کارنامے کی تفصیل تھی۔

''آپ کا خواب پوری توجہ سے پڑھا، تعبیر لکھی جا رہی ہے، بہتر ہے کہ کسی کو سنائی نہ جائے تا کہ اس کے بد اثرات سے محفوظ رہا جائے۔'' پڑھ کر اماں کی طرف دیکھا۔ ''امام صاحب کہہ رہے ہیں کہ تعبیر کسی کو بھی نہ سنائی جائے۔''

''کفایت اس سے لیتی کیوں نہیں میں خود پڑھ لوں گی..... دوا سے.....''

''طبیعت پر بد اثرات کا سایہ لگتا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، خواب دیکھنے والا خطرات میں گھرا ہے، دشمن اپنے خطرناک ارادوں کے ساتھ پیچھے لگا ہے..... اس سے حفاظت..... ت.....'' وہ جلدی جلدی پڑھ رہی تھی، شاید دشمن کے خیالات میں محو تھی کہ حور نے پیچھے سے پیغام جھپٹ لیا۔

''دشمن کے عزائم کے بارے میں باقی ہم خود پڑھ لیتے ہیں۔'' رقعہ لے کر اماں کے پاس پہنچی۔ وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اماں نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔ ''تم پڑھو حور.....'' اور حور نے پڑھنا شروع کیا۔

''دختر چراغ! اپنے اکلوتے بیٹے سے متعلق تمہاری شکایت کو پوری توجہ سے سنا۔ تمہاری یہ درخواست کہ میں اپنے بیٹے شمس کو الٹا لٹکا دوں، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دوں، اسے سخت ترین سزا دوں جائز ہے۔ وہ مسجد کے امام کا بیٹا ہے لیکن نا خلف ہے، میرا دل دکھی ہے لیکن فریادی کی فریاد سن کر نظر انداز کر دینا دستور نہیں۔ جیسا کہ تم نے التجاء کی کہ اسے حویلی حاضر کیا جائے کہ تم اسے سزا دے سکو تو وہ کل حویلی حاضر ہو جائے گا۔ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے میں اجازت دیتا ہوں کہ جیسا چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔ میں اس کے کارناموں کو نہیں جانتا، تم پر اعتبار ہے۔ تم ایک نیک نام، نامور خاندان کی چراغ ہو، شمس سے پریشان ہو تو جائز ہی ہو گا۔ پیغام تمام کرتا ہوں..... کل شمس حاضر ہو جائے گا۔''

نشست گاہ میں سناٹا.....

تمام پیغام پڑھ کر حور نے سب خواتین پر ایک نظر ڈالی۔ چراغ کھڑی تھی سمجھ نہیں آیا کہ بیٹھ جائے یا بھاگ جائے۔

بھاگ جانا بہتر تھا.....

''یہ سب جھوٹ ہے..... الزام ہے..... میرے خلاف سازش ہے۔''

''دشمنوں کی سازش۔'' حور نے سر ہلا کر بزرگانہ انداز میں کہا۔

''تم مسجد گئی تھی؟'' اماں کا لہجہ کتنا سرد تھا۔

''نہیں..... میرا کیا کام مسجد میں.....''

''تم نے کس کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا..... بلاؤ اسے.....''

عین وقت پر پھنسی تھی اگر کفایت کے ساتھ تھوڑی بنا کر رکھی ہوتی اسے آنکھ مارتی تو وہ سب سنبھال لیتی، لیکن اب۔''میں نے پیغام لکھ کر بھیجا تھا، یاد نہیں کس کے ہاتھ بھجوایا تھا۔''عین وقت اس کی یادداشت چلی گئی۔ کوچوان کو بلایا، پوچھا کہ وکٹوریہ کہاں کہاں رکی تھی۔ گواس نے وکٹوریہ کو دوسری طرف رکوایا تھا لیکن کوچوان بھی عقل رکھتا تھا، کچھ اس کے کارناموں سے واقف تھا، پھر اس کے اپنے بھی کئی حساب تھے۔ اس نے معصومیت سے ایسے بتادیا۔

''کئی وقت گزرا بی نہیں آئیں تو میں انہیں دیکھنے کے لیے نکلا یہ شاہی مسجد کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔''

ختم شد..... تمام شد.....

☆.....☆.....☆

حساب شد..... لگام شد.....

چراغ نے چراغ پا ہو کر کوچوان کو دیکھا۔ اس نے اسے بھی جھوٹا اور اپنا دشمن قرار دے دیا۔ سب کی ملی بھگت ہے، اپنے بدلے کھرے کر رہے ہیں۔ وہ کہیں نہیں گئی تھی، وکٹوریہ کہیں نہیں رکوائی تھی۔ لیکن اماں نے اس کا یقین نہیں کیا۔ اسے زبردست پھٹکار سے روشناس کروایا گیا۔ وہ سچ مچ رونے لگی۔ کفایت سمیت سب جھانک کر دیکھتیں اور ہنسی دباتی تھیں۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر وہ بے حال ہوگئی پر اماں نے لحاظ نہیں کیا۔ مروت نہیں دکھائی۔

''تم مسجد گئی تھی نا.....''رات کو حور نے بڑے رازدارانہ انداز سے پوچھا۔

''ہاں گئی تھی..... گئی تھی..... آگے وہ منحوس تھا یہ سب اسی نے کیا ہے۔''

''مان لو چراغ ہمارا نجات دہندہ آچکا ہے۔ کمال عزت ہوئی تمہاری، سب نے سن لیا۔''

حور کو کیا کہتی وہ خود پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ آج تو وہ سچ مچ روئی تھی۔ سچے والے آنسو نکالے تھے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے سچائی اور سچے بندے کی کہیں کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ جھوٹ پسند کرتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے لمبی دعاؤں (بدعاؤں) کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے وہ چاہتی تھی کہ وہ مرجائے، اب چاہتی تھی کہ سارا شہر اسے جوتے لگائے، اس کا سر ہسرے عام قلم کیا جائے۔

امیری کا سر..... یہ سر عام قلم کیا جائے.....

جو وہ چاہتی تھی..... وہ ہو ہی جائے تو.....

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر گزرے۔ اماں نے کفایت کو امام صاحب کے گھر پیغام دے کر بھجوایا۔ اب کفایت

امام صاحب کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ لکھنے کے کام پر جھکے ہوئے تھے۔ شمعیں روشن تھیں..... شمع..... شمس..... وہ کھڑا کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ کفایت آئی تو ذرا سا سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ترچھے سر سے ترچھی نظر..... کفایت اپنی بات بھول گئی۔ حلق کو تر کیا۔ امام صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''وہ میں بیرام حویلی سے آئی ہوں اماں بی نے پیغام بھجوایا ہے۔''

امام صاحب نے دیکھا کہ لاؤ دو پیغام.....

''لکھ کر نہیں لائی منہ سے..... مطلب زبانی پیغام.....'' وہ ہکلا رہی تھی۔

''سنا دو پیغام.....'' امام صاحب ہنس دیے۔ جو کتاب کھول کر کھڑا تھا وہ بھی ہنس دیا۔ کتاب سمیت اپنا رخ کفایت کی سمت پورا گھما لیا۔ اس غریب کی رہی سہی ہمت جاتی رہی۔ آج تل لگانا بھول گئی تھی۔ اچھے کام وہ ہمیشہ بھول جاتی تھی۔ نظر چرا کر چور کو دیکھنا چاہا۔

''وہ..... ہ..... اماں بی کہتی ہیں کہ کسی کو حویلی بھیجنے کی ضرورت نہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی..... نادانی..... مطلب نادانی سے بات کا بتنگڑ کیا بنانا..... بات کو جانے دیجئے.....''

امام صاحب حیران پریشان ہکا بکا کفایت کو دیکھ رہے تھے۔ کفایت نے امام صاحب کا ایسے دیکھنا دیکھا تو مزید سہم گئی۔ وہ کتاب والا مسلسل مسکرا رہا تھا۔ کبھی سنجیدگی کبھی شرارت سے نظر بدلتا تھا۔

''کسے حویلی بھیجنے کی ضرورت نہیں؟'' وہ سمجھے کچھ نہیں تھے اسی بات کا سوال پوچھ لیا۔

کفایت نے پھر حلق تر کیا۔ جس کی بات کر رہی تھی وہ سامنے کھڑا تھا۔ دل سمٹا جاتا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی تو۔ امام صاحب سوالیہ دیکھ رہے تھے کہ بی بی تم اپنے حواسوں میں تو ہو۔

''ان..... انہیں.....'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

''شمس کو.....''

امام صاحب کتنا حیران تھے۔ سر اٹھا کر شمس کی طرف دیکھا۔ شمس نے مسکراہٹ غائب کر لی۔ کتاب رکھی اور ہاتھ سینے پر باندھ کر کفایت کی طرف سیدھا ہو گیا۔ ''مجھ سے کچھ کہا؟''

وہ ویسے ہی سہمی تھی اس نے ایسے مخاطب کیا تو وہ دو تین قدم پیچھے ہٹی۔ ''خدا حافظ امام صاحب.....'' کہہ کر جلدی سے کمرے سے نکلی۔ گھر سے باہر بھاگی۔ دہلیز پار کر کے سانس درست کیا۔ بوا اس پھرکی کو دیکھتی رہ گئیں۔ شمس کھڑکی سے دیکھ چکا تھا، منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک رہا تھا۔

''کہیں کا پیغام شاید کہیں دے گئی۔'' امام صاحب بڑبڑا رہے تھے۔

وہ زیرِ لب ہنسا۔ ''پیغام اس نے درست دیا...... سبق اچھال گیا ہوگا۔''

سب اچھا ہے کی خبر کفایت نے اماں کو کچھ ایسے سنائی۔

''امام صاحب کہتے ہیں میرا لختِ جگر سارے شہر کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے، چاہتے ہیں کہ اسے نقصان ہی پہنچے۔ چاہتے ہیں کہ باپ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو تکلیف پہنچائے۔ ایسا کیا قصور ہوا میرے بیٹے سے! اگر حویلی والے اسے نقصان پہنچا کر تسلی رکھتے ہیں تو مجھے منظور ہے۔ مجھ سے اور میرے بیٹے سے کسی کو تکلیف پہنچے یہ مجھے گوارا نہیں۔''

اماں امام صاحب کے پیغام سے اداس ہوگئیں۔ ''یعنی یہ گئی تھی ان سے شکایت کرنے۔''

''ہاں گئی تھیں۔ پتہ نہیں ان کے بیٹے کے بارے میں کیا کچھ کہا کہ وہ اتنے دلبرداشتہ ہو گئے۔''

اماں اپنے دل کے ٹکڑے سے دلبرداشتہ تھیں۔ حویلی کے ہیر پھیر یعنی کفایت نے مرچ مسالہ لگا کر شمس امیری کی اگلی کہانی کچھ ایسے سنائی۔ ''اس نے کہا میری جو شکایت لگائی گئی میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔'' کفایت نے ہاتھ بلند کیا یعنی جنگ کا اعلان۔ چراغ کو ڈرایا۔

''بدلہ لینے سے پہلے ہی مر جائے گا...... ختم ہو جائے...... '' زیرِ دل بددعا دینی تھی، منہ سے نکل گئی۔

''خود تو مروں گا ہی زندہ دشمنوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' کفایت نے مزید دم دار انداز میں کہا۔

''شفتو (بکواس بند)......'' وہ دھاڑی۔ ''میں دشمن بھی اپنی برابری کے بناتی ہوں۔'' وہ سمجھ گئی اسے دشمن کہا گیا ہے۔

''برابر منہ توڑ جواب مل رہے ہیں۔ نہ تم مسجد جاتیں آگ لگاتیں نہ چنگاریاں تم تک آتیں۔ تمہاری تدبیریں تم پر الٹی پڑ رہی ہیں۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ تم اماں بی کے ہاتھوں پٹو گی اور ہم محظوظ ہوں گے۔''

''کوئی دن نہیں جاتا کہ اسی حویلی میں وہ پٹے گا۔ سارا شہر محظوظ ہوگا، تماش بین ہوگا۔'' بلند آواز سے بددعا دی۔

اس کے کمرے کی طرف آتیں چچی نے یکدم دہلیز کو تھام لیا۔ ان کے چہرے کے رنگ اُڑے۔

شہر تماش بین ہوگا...... اس سنگ...... اُس سنگ...... اس پر وار ہوگا......

دیوانہ دیوانہ...... اس کا نام ہوگا......

☆......☆......☆

سارے گھر کا انتظام بوا کے ہاتھ میں تھا۔ سودا سلف کا کام ماما کرتی تھیں۔ صفائی ستھرائی کے لیے الگ سے دو تھیں،

لیکن گھر میں صرف بوا رہتی تھیں۔ گھر کے کام ہی کتنے تھے۔ امام صاحب ولی صفت کہ دو دن بھی کھانا نہ ملتا تو انہیں یاد بھی نہ رہتا کہ وہ بھوک سے ہیں۔ انہیں مسجد سے ہی فرصت نہیں تھی۔ بوا ہی گھر کا طریقہ سلیقہ قائم رکھے ہوئے تھیں۔ چھوٹے سے باغ کی کانٹ چھانٹ بھی خود ہی کر لیتی تھیں۔ فرصت میں اپنے سفید غرارے درست کیا کرتیں۔ کبھی وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر پان کھالیا کرتا۔ اس کے لیے پان نئی چیز تھی، اسے جامن کے پتے کھانا یاد تھا لیکن یہ پان..... پہلے دن بوا کے ہاتھوں کھایا تو بے اختیار ہنس دیا تھا۔

''شہر والوں کے سب رنگ نرالے ہیں۔''

''شہر تم ایسے کہتے ہو جیسے خود کسی دوسری دنیا سے آئے ہو۔''

اس کے چہرے کے رنگ بدلے۔ ماں باپ سے جدا رہنے والے دوسری دنیا میں ہی رہتے ہیں۔

''میں گنوار ہوں..... ویسے بوا گنوار کہتے کسے ہیں۔'' وہ گنوار تھا، گنوار کسے کہتے ہیں یہ نہیں جانتا تھا۔

''دیکھو بیٹا بات گنوار پن کی نہیں، بس انسان کچھ قانون اصول بنا لیتا ہے کہ جو سلیقے طریقے سے اٹھے بیٹھے بات کرے وہ شہری ہے۔ رات کو ململ پہنے کہ نیند میں خلل نہ ہو، دن میں سلیقہ بند لباس زیب تن کرے۔ سلیم شاہی جوتے ہوں، سلفچی میں منہ دھوئے۔ وہ تہذیب یافتہ ہے۔ تمیز و قرینے کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ جو دوسری پابندیاں ہیں وہ پوری ہوں گی تو تہذیب والے کہلاؤ گے، سب فریب ہے۔ یہ سب لباس سے کم اطوار سے زیادہ ہے۔ میں نے ان امیر زادوں کو بھی دیکھا ہے جو چاندی کے برتنوں میں کھاتے ہیں اور کوئلہ صفت زبان رکھتے ہیں۔ جب بولتے ہیں دوسروں کو نیچا دکھاتے ہیں۔''

بوا تخت پر بیٹھیں چراغ کی بتیاں بل دے رہی تھیں۔ ان کے سوتی دوپٹے کا پھیلاؤ بہت تھا۔ ایسا لگتا سارے گھر میں پھیلا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ روئی کو بل دینے لگا۔ ان کے کمرے میں تیل کے چراغ جلتے تھے۔

''تمہاری ماں کو چراغ پسند تھے ایسی اونچی پرورش پا کر بھی سادگی کو پسند کرتی تھی۔ تیل کی بو سے پریشان نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ روشنی ہی ہے اب اس میں کیا تقاضے کرنے۔ کبھی کسی شے کی فریاد نہ کی۔''

چراغ کی فریاد..... چراغ کے تقاضے.....

''چراغ جلتا بھڑکتا ہی اچھا لگتا ہے۔''

اس نے بوا کے گال پر ایک چٹکی بھری۔ بوا سرخ ہو گئیں۔ چراغ کی بتیاں بنانے کے بعد وہ ابا جی کے پاس آیا۔ انہیں اپنا کام یاد دلایا۔ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ صبر رکھو ہو جائے گا۔ پیغام بھجوا دیا ہے، فرصت ملتے ہی وہ آئے گا تو بات

کریں گے۔وہ جب اپنے کام کا پوچھتا ان کے چہرے پر فکرمندی کند ہو جاتی۔اتنا تو جان چکے تھے کہ وہ ضدی ہے۔اس کی اپنی سمجھ ہے،اسی سے کام لیتا ہے۔آج کل مسجد آجاتا ہے ان کے کئی کام کر دیتا ہے۔ضروری غیر ضروری خطوط لکھ کر ارسال کرتا ہے۔مختلف دینی مسائل پر جو سوال بھیجے جاتے ہیں،ان کی ہدایات پر حوالہ جات کھنگالتا اور جواب تحریر کر دیتا ہے۔وہ اسی میں خوش تھے کہ بیٹا ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

''شہر دیکھ لیا.....؟'' وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔دونوں مسجد کے حوض کے کنارے ٹہل رہے تھے۔

''آپ اپنے شہر پر اتنا اتراتے کیوں ہیں؟'' سوال کسی اور سے کرنا تھا سوال کسی اور سے کیا۔

وہ بے ساختہ ہنسے۔''اپنی چیزوں پر بھی نہ اترائیں تو کہاں جائیں۔''

''اپنی چیزیں،اپنے شہر..... یہ شہر اپنے کیسے ہوتے ہیں کیا یہاں پیدا ہو جانے سے؟''

''ایسے بھی..... لیکن جو بانہیں پھیلا کر سینے سے لگا لے وہ اپنا ہو جاتا ہے۔اس شہر کے دروازے ہمیشہ کھلے ملتے ہیں جیسے گھر کے دروازے۔یوں گھر جانے میں جھجک نہیں،ویسے ہی یہاں رہنے میں بھی عار نہیں۔بتاؤ پھر اسے اپنا کیوں نہ کہیں۔''

''صرف اسی شہر کے دروازے کھلے نہیں ملتے ہوں گے اور شہر بھی ایسے ہوں گے۔''

''شاید..... لیکن ہمیں اسی کے ملے۔ہماری جان پہچان اسی سے ہوئی۔یہ شہر دریا کنارے آباد ہے۔دریا کنارے آباد ہونے والوں کے دل کشادہ ہوتے ہیں،وہ خوش آمدیدی ہوتے ہیں۔اس لیے لاہور نے اپنے دروازے ہر کسی پر کھول دیے کہ آؤ جیسے ہم جیتے ہیں تم بھی جیو۔کہنے والے کہتے ہیں کہ اس نے حملہ آوروں کو راستہ دیا وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس نے اپنی زرخیزی اور نعمتیں خود تک محدود نہیں رکھیں۔دریا کنارے آباد شہر نے دریا دلی سے باقی دنیا کو بھی اپنی دنیا میں شریک کیا۔''

''انہیں اپنی روٹی چھن جانے کا ڈر نہیں تھا اسی لیے اپنی دنیا میں خوش آمدید کہتے رہے۔دریا کنارے آباد ہونے والے کشادہ دل نہیں ہوتے،حالات انہیں کشادہ دل بنا دیتے ہیں۔ورنہ جو اپنے لیے دو نوالے مشکل سے جمع کرتا ہو گا وہ کسی اور کو ان میں شریک کیوں کرے گا۔اپنے شہر اور دریا وہی بانٹتے ہیں جو خود سیر ہو چکے ہوں۔''

امام صاحب دنگ رہ گئے۔وہ اتنا سمجھدار کب ہوا۔وہ گاؤں میں پلا بڑھا تھا اس نے یہ سب کہاں سنا،کس سے سیکھا۔

''شہر کی دیواریں بلند ہیں لیکن ناقابل تسخیر نہیں۔جہاں روٹی کی حفاظت موجود ہو وہاں شہر کی حفاظت کی فکر نہیں رہتی۔''

''غلط..... بالکل غلط..... دیواروں سے زیادہ اپنے زور بازو سے حفاظت کو اہم جانا گیا۔کیا تم دیکھتے نہیں شہر میں کیسا

مثالی پہرا ہے۔'' وہ ہکلا گئے۔ کیا بیٹا شہر سے بھی دشمنی رکھتا ہے۔ اسے برا جانتا ہے۔

'' آنے والے اپنے ساتھ نئی زندگی لاتے ہیں۔ اس شہر کو ہر رنگ کی چاہ رہی۔ یہ زرخیز زمین ہے، زرخیز دل رکھتی ہے، چاہتی ہے ہر ساز کا گیت یہاں موجو ہو۔ اسی لیے اس شہر میں ہر رنگ، ہر نسل، ہر عقیدے کا انسان خوشی سے آباد ہے۔''

'' تمہاری ساری بات درست نہیں۔ یہ عقیدوں کا نہیں انسانوں کا شہر ہے۔ انسان دوستی اور احترام کا شہر۔ شہر کے تخت بدلتے رہے لیکن دل نہیں بدلا۔ شہر ملکیت نہیں سانجھ ہوتے ہیں، شہروں کے دروازے خوش آمدیدی نہ ہوں تو پھر وہ جلد نابود ہو جاتے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ یہ شہر سلامت ہے۔ اس کی بنیاد رام کے بیٹے راجہ لوہ نے رکھی اور اکبر کے بیٹے جہانگیر تک نے اس سے محبت کی۔ سب نے اسے اپنے اپنے انداز میں سنوارا۔ لیکن یہ لوہ کا تھا نہ جہانگیر کا۔ یہ ہر اس دل کا تھا جو اس میں آباد تھا۔''

اس نے اپنے باپ کے جذباتی پن کو دیکھا۔ استہزائیہ ہنس دیا۔ انہیں اس کے انداز سے تکلیف پہنچی۔

'' کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہندو باراتیں مسجدوں کے سامنے خاموشی سے گزرتی ہیں، باجے تاشے گرا لیے جاتے ہیں اور مندروں کے احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی جاتی۔ شہر میں ہندو سکھ مسلمان پارسی سانجھ سے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے اپنے اپنے ہیں لیکن شہر ایک ہے۔ شہر کے دروازے حفاظت کے لیے تو بند ہوتے ہیں لیکن بے دخلی کے لیے نہیں۔ آج تک کسی کو شہر سے بے دخل نہیں کیا گیا۔ مسلمان گھرانے ہندو سناروں سے لین دین کرتے ہیں۔ ہندو گھرانے مسلمان تاجروں سے کپڑا خریدتے ہیں۔ کھانے پینے کے برتن الگ رکھے ہیں لیکن دل جوڑ لیے ہیں۔ وفاداری کے لیے انسان نمک کھاتا ہے اور وقت پڑنے پر حلال کرتا ہے۔ یہ شہر نمک کھاتا ہے اور کبھی حرام نہیں کرتا۔ تم یہاں اجنبی ہو گے لیکن یہ تمہیں کبھی اجنبی نہیں سمجھے گا۔ اور یہی اس شہر کی خاصیت ہے، بانہیں پھیلا کر اپنا لیتا ہے اور پھر کبھی جانے نہیں دیتا۔''

پھر کبھی جانے نہیں دیتا..... قید کا دروازہ..... اسیر کا شہر.....

'' ہر کوئی اس شہر کی حمایت کیوں کرتا ہے؟'' وہ تمسخر سے ہنس دیا۔

'' جو عزیز ہو..... دل کے قریب ہو..... اس پر فخر اور ذکر کا کوئی موقع نہیں جانے دیا جاتا۔''

'' ہر دم ذکر ہو.....'' وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

'' تم بھی یہی پیدا ہوئے ہو شمس! پھر گاؤں کی طرف ہجرت کی تھی۔ دیکھو جو تمہارا تھا اس نے واپس تمہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ انسانوں میں خون کی کشش ہوتی ہے، مٹی میں شناخت کی۔ خون میں جو نمک شامل ہوتا ہے وہ مٹی سے ہی نکلتا ہے۔ یہ تمہاری مٹی ہے، تمہیں اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ بغداد سحر بے مثال یہ اس کا سایہ با کمال!'' وہ کتنا جذباتی ہو چکے

تھے۔

''بغداد کو اس کی کیا پرواہ رہی ہوگی۔'' شانے اچکائے۔

''تاریخ ابھی تک بغداد کی سحر انگیزی پر فدا ہے شمس!''

''تاریخ کو آپ کے شہر کی سحر انگیزی کی کیا ضرورت درپیش ہوگی۔'' اس نے پھر طنز کیا۔

''تمہیں ایسی زمین پر کھڑے ہونے پر فخر نہیں جہاں مغلیہ حکومت کی پہلی ملکہ نور جہاں کے نام کا سکہ چلا۔ جس کے سکے کی قیمت بادشاہ کے سکے کی قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔''

وہ اپنے باپ کی طرف دیکھ کر رہ گیا..... دیکھا اور پھر جاندار قہقہہ لگا دیا۔

''ہاں! میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں، یہ زمین ایسی ہے کہ خاتون کے نام کے سکے چل سکیں۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نشانہ خطاء کیے بغیر چار شیروں کا شکار کر سکے۔ زمانے میں ان کی مثال بیٹھ سکے۔ زرخیز شہر، دھواں دھواں چراغ شہر۔'' اس کی آنکھیں دیر تک مسکراتی رہیں۔

''تمہیں شہر میں کیا اچھا لگا؟'' جوان بیٹے کے گال دہک رہے تھے۔ دھوپ میں بال چمکتے تھے۔ ایسا جمال دیکھ کر باپ کیسے نہال نہ ہوتا۔

''بے حیا..... بدتمیز..... بدتہذیب لوگ.....'' بے ساختہ منہ سے نکلا۔

وہ چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''اور برا کیا لگا؟''

''یہی..... زبان دراز..... جھوٹے..... چالباز لوگ۔''

وہ کچھ نہیں سمجھے۔ جوانی کی اپنی باتیں، اپنے معنی، اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

بے حیا، زبان دراز، چالباز لوگ کئی صدیوں سے پاک دامن کی شادی کے لیے ایک نمونہ ایک تحفہ بنا رہے ہیں۔ شیروں کا شکار کرنے والے ہرن پر ہاتھ صاف کر چکے ہیں۔ حویلی میں اکثر کشیدہ کاری کے نمونے بنانے والیاں اپنے شاہکار لاتیں اور بیچ جاتیں۔ ایک کشمیری عورت آئی تھی مہتاب بھابی نے اس سے چند ٹانکے سیکھے تھے۔ ان کی یہی مصروفیت تھی۔ دل کہیں لگتا نہیں تھا انہوں نے دھیان یہاں وہاں لگا لیا تھا۔ کچھ اسے بھی شوق ہوا، اس نے بھی چند ٹانکے سیکھ لیے تھے۔ پھر جہاں جو کپڑا دکھائی دیا اسے شوق سے برباد کر دیا۔ ایک گرم کشمیری کرتا بنایا تھا جو ساری سردیاں کفایت کو پہننا پڑا۔ ساری سردیاں اس کا منہ بھی بنا رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بنائے نمونوں کو استعمال میں بھی لایا جائے۔ وہ اتنے بھدے

اتنے بدصورت ہوتے کہ اماں دل پر پتھر رکھ کر انہیں استعمال میں لاتیں۔ ایک مخملی آرائش کا نمونہ تھا جس پر دو ہرن بنے تھے۔ اب وہ ہرن ہی ہیں یہ منہ سے بتانا پڑتا تھا۔ ہرن کے ایسے لمبوترے منہ گوشہ زمین پر شاید ہی کہیں کسی نے دیکھے ہوں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سب سے اہم جگہ پر لٹکایا جائے۔ یعنی وہ حویلی کی سب سے خاص جگہ کو برباد کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک شاہکار تخلیق ہے۔ جنگل جھیل اور چہلیں کرتے دو ہرن۔

''دونوں ہرن اپنی ایسی تصویر کشی پر ماتم کر رہے ہوں گے۔'' حور نے بیان دیا تھا۔

کفایت نے ہی جرأت کی کہ نشست گاہ کی خوبصورتی کو ہرنوں کی دھما چوکڑی سے بچالیا۔ کچھ دن گزرے تو اس پر بہانے سے موم گرادیا۔ بے چارے پہلے ہی پہچانے نہیں جاتے تھے اب اور بے ہرن ہو گئے۔ چراغ ابھی بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ موم کو صاف کروانے کی کوشش میں فنون کا نمونہ مزید برباد ہو گیا۔

''یہ پہلے سے بھی گیا، کیا ضرورت تھی کفایت۔'' اماں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

کفایت نے سب کے ذوق جمال پر احسان کرنا چاہا الٹا مزید تکلیف دہ بنا دیا۔ نشست گاہ میں آتے ہی اس پر نظر پڑتی اور دل سہم کر رہ جاتا کہ یا اللہ کیا دیکھ لیا۔ اب ایسی ہی کوئی شاہکار چیز پاک دامن کی شادی میں تحفہ دینے کے لیے بنائی جا رہی تھی۔ اس بار مخمل کے سیاہ پارچے پر دیا پر رات کے آسمان کا منظر دکھایا جانے والا تھا۔

''دریا کسی سانپ کی طرح لگ رہا تھا جیسے بس ابھی سر اٹھائے گا اور ڈس لے گا۔'' حور نے کفایت کے کان میں کہا۔

''چودھویں کا چاند ایسا کہ مانو ابھی نیچے آگرے گا۔'' نوبہار نے معصومیت سے تبصرہ کیا۔ اسے چاند کی فکر تھی۔

تینوں کو پاک دامن کی فکر تھی جسے یہ تحفہ وصول کرنا تھا۔ اماں کو پوری امید تھی کہ اس کی شادی تک یہ مکمل نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے پاک دامن اس تحفے کی وصولی کے صدمے سے محفوظ رہے گی۔ خوشی کے موقع پر تو اسے ہرگز نہیں دیا جانا چاہیے۔ پھر کہاں لکھنؤ والوں کا ذوق جمال کہاں یہ بھدا ہاتھ کا کمال۔ وضع داری میں چپ رہیں گے، پر بدکلامی اور بدنمائی ان کا مزاج کہاں ہے۔ اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ مدت سے حویلی میں شادی کے ساماں کی تیاریاں تھیں۔ ہنرمند خواتین کا آنا جانا زیادہ ہو چکا تھا۔ صرف پاک دامن کو دینے کے لیے ہی اتنا کچھ تیار کروالیا تھا کہ جیسے جہیز ہو۔ یہ اپنی خالہ کی لاڈلی تھی، پاک دامن اماں کی۔ پھر چراغ کی نند تھی۔ دونوں میں ایسی دوستی تھی کہ کبھی خطوط کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا اور ختم نہ ہوتا۔ اور کبھی ایک عرصے تک خط نہ آتے تو اماں سمجھ جاتیں کہ چراغ نے ضرور کوئی آگ لگادی ہے۔

''ایک پاک دامن ہے معصوم بچی! ایک میری اکلوتی ہے مجھ سے پورا پورا خراج لیتی ہے۔ کہتی ہے کہ بس ہر دم فساد ہو..... ہنگامہ برپا رہے۔''

☆.....☆.....☆

ہر دم فساد..... ہر لمحہ ہنگام.....

اس کی سواری جہاں سے گزرتی جس وقت گزرتی، جتنی بار گزرتی، گھڑسوار آس پاس رہتا.....

ناداں گھڑسوار.....

دریا کنارے گئی۔ دوسرے کنارے پر وہ دکھائی دیا۔ پل کے پاس رکی، وہاں بھی اس کا سایہ پڑا۔ وہ دن بدل کر گئی، تب بھی یہی ہوا۔ وہ پہر ٹال کر گئی، پھر یہی ہوا۔ وہ اس سے ڈرتی نہیں تھی لیکن دیکھ وہ یہ رہی تھی کہ وہ اس کا پیچھا ہی کر رہا ہے۔ مسجد سے آئے پیغام کے بعد وہ نیا فساد اپنی جان پر نہیں لینا چاہتی تھی۔ اب اماں واقعی میں اسے اٹھا کر کنوئیں میں پھینکوا دیتیں۔ اس کی حسرت تو تھی کہ کوئی نیا فساد کرے لیکن خطرہ تھا کہ اس میں اس کی جان بھی سولی پر لٹک سکتی تھی۔ ایک چور کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنا خسارہ تھا۔

''تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟'' ایک دن اسے باغ کے کنارے پکڑ لیا۔

اس نے آس پاس دیکھا کہ کس سے مخاطب ہو! ''یہ تو مجھے کہنا تھا.....'' سنجیدگی سے بتایا۔

''کہ میں تمہارا پیچھا کر رہی ہوں؟''

''بالکل.....'' سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔ طنزیہ کہا۔

''کبھی کسی لڑکی کو کسی لڑکے کا پیچھا کرتے دیکھا ہے؟''

''ہاں..... تمہیں.....'' ہاتھ سینے پر بندھے رہے، آنکھوں کے اشارے سے اسے جتایا۔

اس نے اتنا بدلحاظ انسان زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ فتنہ گر! اس کے پاس خنجر ہوتا وہ اس کی زبان کاٹ دیتی۔ کتنا چلتی تھی۔

''تم اپنے مرنے کے ارادے پر غور کیوں نہیں کرتے۔''

''تم جب بات کرتی ہو مرنے کی کرتی ہو..... تم خود کیوں نہیں مر جاتی..... بلکہ تم زندہ ہی کیوں ہو۔''

کبھی سنا نہیں تھا نا کہ مر جاؤ..... آج سن لیا تھا.....

''میری حیثیت ہے کہ میں زندہ رہوں.....''

''مجھ میں جرأت ہے کہ میں مر مٹوں۔'' اس نے بھی جتا دیا۔ وہ کامل شامل سنجیدہ تھا۔

''وہ خط تم نے مجھے لکھا تھا..... جھوٹ مت بولنا..... مجھے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا.....''

''بنے بنائے کو مزید کیا بنانا۔''اطمینان سے کہا اور آگے چل دیا کہ تمہاری بے کار باتیں سننے کی فرصت نہیں۔

''خط کا جواب ٹال دیا اور بے وقوف میں رہی۔''

چلتے چلتے سر گھما کر پیچھے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اس سے خط کا سوال کرتی ہے۔

خط کا سوال..... خط کا جواب.....

خط کی داستان.....

☆.....☆.....☆

اس نے خط کھولا، خط پڑھا۔ مہابت چور چور چلاتا رہا۔

چراغ کے خط میں لکھا ہے.....

''یہ سلام..... ایک اور سلام، ذرا میری حویلی میں، میرے سامنے حاضر ہو کر پیش کرنے کی ہمت تو کرو جناب!''

وہ اسے سب کے سامنے آ کر سلام کرنے کا عندیہ دے رہی تھی۔ وہ اسے للکار رہی تھی کہ آؤ سلام کر جاؤ، پھر دیکھو کہ سلام کا جواب ملتا ہے یا جان کی سلامتی پر عذاب گرتا ہے۔ وہ خط پڑھ کر ہنستا رہا۔ محبوب جان کی طرف دیکھا۔

''کیا کہتے ہو سلام کرنے جاؤں؟''

''بھاگ جاؤ..... میں اس کے ارادے دیکھ آیا ہوں۔''

''دوبارہ نہ دیکھنا اسے..... تمہیں اپنی آنکھیں نکلوانی پڑیں گی۔''

''تم سنجیدہ ہو.....''

''وہ سنجیدہ ہوتی ہے.....''

سنجیدہ آنکھیں، شرارتی آنکھیں۔ وہیں سے چلتا ہوا مسجد کی طرف آیا۔ خط مٹھی میں دبا تھا۔ اسے دبائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

''مجھے آپ سے ایک کام ہے ابا جی!'' بڑے مان سے کہا۔

''سو کام باپ کی جان.....'' وہ مسکرا کر اس کی سمت سیدھے ہوئے۔ نہال ہو گئے۔

''مجھے کام سے رکھوا دیں.....''

''کام سے رکھوا دوں؟'' وہ سمجھے نہیں۔

''میں جوان ہو چکا ہوں مجھے اب کوئی کام کرنا چاہیے۔'' (کیا اچانک ہی جوان ہوا تھا۔ ابھی فوراً سے؟)

''ہاں کر لینا چاہیے..... پر چار دن اپنے باپ کی محبت پر فراغت کے دیکھ لو مجھے خوشی ہو گی۔''

وہ مسکرا دیا۔ ''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟'' بے وقت سوال۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا۔ ''محبت سو جان..... محبت سو دل.....''

جس کی ملنی چاہیے تھی اسی کی ملی نہیں تھی۔ باپ کے سینے سے لگا تو محبت کی خوشبو پر عطر معطر ہو گیا۔ یہ دل..... یہ محبت..... جو بھاری قیمت پر بھی نہیں ملتی وہ بھاری قیمت چکا کر نبھائی جاتی ہے۔ محبت! یہ دل و جاں سے قربانی مانگتی ہے۔

''پھر میرا کام کر دیں.....'' محبت کا سوال، محبت کی التجاء۔ وہی قربانی کی درخواست۔

''بہتر! مجھے کچھ دن دو میں التمش سے بات کرتا ہوں۔''

''مجھے آپ کے دوست التمش کے ساتھ کام نہیں کرنا مجھے کہیں اور کرنا ہے۔''

انہیں تشویش ہوئی۔ ''کہاں کرنا ہے..... گاؤں واپس جانا چاہتے ہو؟ ایسا ظلم نہ کرنا اب میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔'' اس کی ٹھوڑی کو دو انگلیوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

''اب تمہیں دیکھ کر صبح شام کرتا ہوں، دیکھو میرے صبح شام نہ لے جانا۔''

اس نے چند لمحے ابا جی کی طرف دیکھا۔ ''مجھے بیرام جنگ کی حویلی جانا ہے۔''

ایک رنگ آ کر امام صاحب کے چہرے سے گزر گیا۔ انہیں لگا جیسے اس نے بہت کچھ کہہ دیا۔ ''کیا کہتے ہو؟''

''نہیں کر سکتے..... ایسا کہہ دیں.....'' اس نے فوراً پشت پھیر لی۔ تیزی سے قدم کھینچنے لگا۔ جس تیزی سے قریب آیا تھا، اسی تیزی سے دور ہوتا چلا گیا۔ مسجد کی زمین اس کے پیروں کی تندی سے بے آواز گونجنے لگی۔

''شمس..... میرے شمس..... رکو.....'' باپ کی آواز کانپ کر رہ گئی۔ محبت امتحان لیتی ہے اور کرنے والوں سے لیتی ہے۔ اس نے خفا خفا پلٹ کر ایک نظر انہیں دیکھا۔ باپ کے چہرے پر لکھے سارے سوالوں کو ایک ہی نظر میں پڑھ لیا۔ ہر سوال کے ساتھ تشویش کی گہری لکیر تھی۔ پھر سے اپنا رخ گھما لیا۔ پھر سے اجنبی بن گیا۔

''قلعے جیسی حویلیاں مجھے ڈراتی ہیں شمس!''

''مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا.....''

''تم جوان ہو..... پھر تم باپ بھی نہیں ہو.....''

یہ ایسی بات تھی کہ اس کا دل درد سے دھڑک اٹھا۔ دل چاہا سب چھوڑ کر باپ کے قدموں میں ڈھیر ہو جائے۔

''میں ہوں باپ..... اولاد والے کمزور دل ہوتے ہیں۔'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اس نے باپ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ وہ ضدی تھا، کم ہی ارادے ٹالا کرتا تھا۔ باپ کی طرف دیکھ کر ارادہ ٹال دیا تو؟

"مجھے کچھ دن دو..... مم..... میں..... کرتا ہوں کچھ....." ان کی ہمت ہی کہاں ہوتی تھی کہ کھوج کرتے۔ سمجھتے تھے ناراض ہوگا اور چھوڑ جائے گا۔ وہ چھوڑ گیا تو اب وہ کیا چھوڑیں گے۔ دنیاداری چھوڑ چکے تھے۔ کیا اب دنیا چھوڑنی ہوگی۔

اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔ اجنبیت جاتی رہی۔ واپس باپ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔ دنیا میں ایسا کوئی محبت پانے والا نہیں گزرا جس نے محبت کو ناحق استعمال نہیں کیا۔

اپنے حق..... ورنہ دل کے حق میں.....

کئی دن لگے..... بہت دن گزرے.....

بیرام مسجد میں امام صاحب کے ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وہ اونچے گنبد کی چھت کے نیچے مچان پر چڑھا تھا۔ کتنی اونچی چھت تھی۔ وہ چھت تک بلند تھا۔ مرمت کا کچھ کام کر رہا تھا۔ بیرام مچان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ چلتے چلتے رکا اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"تو یہ تم ہو بازی گر.....؟"

اس نے بھی سر جھکا کر پوچھنے والے کو دیکھا۔ دونوں بہن بھائیوں کی آواز میں خاصا جلال تھا۔ کان سے گزرتی آواز دل دہلا دیتی تھی۔ وہ ان دنوں شہر سے باہر تھا جن دنوں اس کی گمشدگی کی خبر عام ہوئی تھی۔ بعد میں بھی کبھی امام صاحب کے بیٹے سے سامنا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کم لوگوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ کسی پر کیا گزری اسے زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ مرحوم باپ کی وجہ سے اکثریت کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔

بازی گر چپ بیرام کو دیکھتا رہا۔

یہ بازی گر..... حویلی کے احاطے میں کھڑا ہے۔ زنان خانے میں موجود ہے۔ وہ گنوار رہا ہوگا اب سنور کر کھڑا ہے۔ ابا جی نے درزی سے بہت اچھے کپڑے بنوا کر دیے تھے۔ بوا نے کان کے قریب آنکھ کا کاجل لگا دیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو....." وہ مسکرا رہی تھیں۔

"سلام کرنے....." وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"السلام علیکم....."

مسکرا کر کہہ رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں چراغ کا بھیجا خط دبایا ہے۔ وہی ہاتھ اٹھا کر سلام کر رہا ہے۔ حویلی کی ہر سانس کی

سانس بے حال ہوئی۔ ایسا دل تھام لینے والا لمحہ آیا کہ جو جہاں کھڑا تھا وہیں رہ گیا۔ وہ اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ وہیں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ نڈر تھی۔ جرأت مند تھی لیکن اس وقت اسے اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہیں آیا۔ وہ بیرام کے ساتھ تھا۔ بیرام اماں کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ اماں کے سامنے کھڑا تھا۔

مٹھی میں خط دبا تھا.....

ایک خط..... اُس کا خط.....

سلامِ دشمناں..... جوابِ دوستاں.....

☆.....☆.....☆

اماں سلام کا جواب دینا بھول گئیں۔ وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ اس کی اتنی شہرت سنی تھی کہ اب اسے دیکھ کر اپنی فکریں بھول گئیں۔ بھاگ دوڑ کر کام سمیٹتی کفایت جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ اسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس نے امام صاحب کے شہرت یافتہ بیٹے کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس سے بات کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اعزاز جاتا رہا۔ آج وہ سب کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کام کرنے والیاں سر اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ حویلی میں بہت کچھ ہوتے دیکھا تھا۔ شہر میں بھی بہت کچھ برپا ہوا تھا۔ اب جب سے شہر میں امام صاحب کا بیٹا آیا تھا ان کی زندگیوں میں کھٹا میٹھا بھونچال آنے لگا تھا۔ ہر دن نیا واقعہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں وہاں کھڑکیوں دروازوں، اوٹ سے سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ مہتاب بھابھی ایک ستون کے پیچھے سے اپنے شوہر اور اس لڑکے کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک نظر اوپر چراغ کی طرف بھی دیکھا۔

''کیسی بات ہے داستانیں بنتی چلی جاتی ہیں۔'' زیر لب بڑبڑائیں۔

چچی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ایک دم حویلی میں اتنا سناٹا کیوں ہو گیا۔ وہ تو شک خانے میں صندوقوں کے ساتھ مصروف تھیں۔ پاک دامن کی شادی کے سلسلے کا کچھ سامان دیکھ رہی تھیں۔ کفایت کو آوازیں دیں لیکن وہ جا کر واپس نہیں آئی۔ جھلمل غرارہ ہاتھ میں لے کر کفایت کو آوازیں دیتیں خفگی سے باہر نکلیں۔ کفایت ستون کے ساتھ بت بنی کھڑی تھی۔

''تمہیں کام سے بھیجا تھا تم یہاں کھڑی ہو۔'' خفا ہوئیں۔

کفایت نے گردن گھما کر چچی کی طرف دیکھا اور واپس گردن گھما لی۔ چچی اس کی ادا پر مسکرا دیں۔ ''چلو کفایت! شادی سر پر ہے بہت کام ہیں۔'' انہوں نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ وہ ڈھیٹ بن کر اپنی جگہ پر جمی رہی۔ چچی کو اُس کی نظر کے تعاقب میں دور اس پار دیکھنا پڑا..... دیکھا کہ ایک لڑکا کھڑا ہے..... لڑکا جس کی نظر لحظہ بھر کے لیے اوپر چراغ کے کمرے کی

سمت بلند ہوئی۔ وہ بلا کی سنجیدگی لیے کھڑا تھا۔ چھت پر آنے والا آج اسی چھت کے نیچے اماں کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ اس کی قسمت تھی یا پھر اس کا ارادہ۔

''یہ.....'' چچی کو گمان تھا لیکن یقین نہیں تھا۔

''وہی ہے.....'' کفایت نے شوق سے تصدیق کی۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔'' چچی کفایت کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔

''اب جانے کیا تماشا ہوگا۔'' کفایت بری بوڑھیوں کی طرح بڑبڑائی۔

''چراغ کی کوئی شکایت لایا ہے.....؟'' چچی بھی بس۔

چراغ کا سلام لایا تھا.....

''امام صاحب نے خاص مجھے بلا کر درخواست کی تھی کہ اسے کسی بھی کام سے لگا دوں۔ میں انہیں انکار نہیں کر سکا۔ پھر بار بار کہتے رہے۔ کہتے ہیں سب کام کر لیتا ہے۔ جلدی کام سیکھ جاتا ہے۔ آپ کو باغ کی طرف کی فکر رہتی ہے۔ مجھے کچھ خاص نہیں سوجھا، چھت کی مشرقی سمت جو مچان ہے اس پر پہرا دیا کرے گا۔ حویلی کی نگرانی ہوتی رہے گی۔ شہروں میں وبال برپا ہوتے دیر نہیں لگتی پھر گھروں میں کیا دیر لگے گی۔''

اشارہ کیا کہ حقہ منگوائیں۔ حقہ لانے والی کفایت دم سادھ کھڑی تھی۔ اشارہ دیکھ کر حقے کی تیاری کا کہنے بھاگی۔ پیچھے چچی سے ٹکرائی۔ چچی نے الجھ کر دیکھا۔ ''کفایت تمہارا رشتہ تو نہیں آیا جو ایسے بوکھلا رہی ہو۔''

''آپ کیا جانیں کیسا طوفان آیا ہے۔'' وہ زیر لب مسکرائی۔ نہ جانے کس سوچ سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''اپنے گودام کے کام سے لے جاؤ۔'' کتنی مشکل سے اماں نے کہا۔

''خیال یہی تھا لیکن پھر سوچا امام صاحب نے منہ سے کہا تھا کہ حویلی میں ہی رکھوں۔ والد صاحب بہت دم بھرتے تھے امام صاحب کا۔ شاید اکلوتی اولاد کو نظروں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ حویلی میں یا دوکوڑی کے کام ہیں ورنہ وہ کام جو میرے خاص ملازم ہی کرتے ہیں۔ اس کی نہ عام میں جگہ بن رہی ہے نہ خاص میں۔ فورا اپنا حساب کتاب بھی نہیں سونپ سکتا۔ اسے جانچ لوں پھر طے کروں گا فی الحال اسے نگرانی پر رکھیں۔''

اماں کو بیٹے سے سلجھی باتیں طریقے سے کرنی نہیں آئی تھیں۔ اتنی الجھی بات سلجھا کر کیسے کرتیں۔ بیٹے کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔ ساری حویلی کے معاملات اس کے حکم پر تھے۔ ایک چچا الہ آباد رہتے ان سے کبھی کبھی مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ ماں کو کیا سمجھتا تھا۔

''آپ نے ہی کہا تھا کہ چھت کی حد بندی بلند کروادوں۔''

''تو یہ حد بندی کھینچے گا۔'' کتنا چڑ چکی تھیں وہ۔ سر پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گئیں۔

''یہ نظر رکھے گا۔ امام صاحب کا بیٹا ہے، ان کی نیک نامی مشہور ہے کم یہ بھی نہیں ہوگا۔ کیوں ڈرتی ہیں۔''

اماں بیٹے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ بیٹا اپنی حیثیت کے رعب میں تھا کہ کسی کی مجال ہے جو حویلی میں رہ کر بھی اپنی آنکھ میں بال رکھے۔ وہ کھال پہلے کھینچے گا پھر جان لے گا۔ گھر کا ہر مرد اسی زعم میں تھا۔ ان کے خاص عام ملازم ان کا جلال اور اپنی اوقات پہچانتے تھے۔ فرنگیوں کی برتری کے احساس نے انہیں کمتری کے طیش میں مبتلا کر دیا تھا۔ طاقت کی دوڑ میں اپنوں کو ہی روندنے پر تیار تھے۔

''حوصلہ مند ہے مسجد کے گنبد صاف کر رہا تھا۔''

''تمہیں مچانوں پر پہرے داروں کی عجب سوجھی۔''

''عرصے سے خیال تھا اماں! امام صاحب نے کہا تو سوچا یہی بہتر ہے۔''

''فصیل بند شہر میں رہتے ہیں تمہیں پہرے دار کی ضرورت کیا ہے۔''

''شہر کی فصیل قلعے کی چار دیواری سے زیادہ بلند اور مضبوط نہیں پھر بھی قلعے پر پہرے دار رہتے ہیں۔''

وہی بہن بھائیوں کی لاجواب کر دینے والے عادت۔ اماں نے پہلو بدلا۔

''آپ نے ہی کہا تھا کچھ ایسا انتظام کر دوں کہ کوئی چھت پر آ جا نہ سکے۔''

اماں نے گہرا سانس لیا۔ بیٹے نے کیا جو انتظام کیا تھا۔ وہ جتنا اعتراض کرتیں اتنا اسے شک میں مبتلا کرتیں۔

''ایسے کیوں نہیں کہتے کہ جو بچی رہ گئی وہ دھاک سب پر بٹھانا چاہتے ہو۔ چوہدری دلاور سے تمہاری تلخ کلامی ہوئی، انہی کی چھت کی طرف پہرے دار رکھ رہے ہو۔ کیا یہی ہمسائیگی ہے کہ نیچا دکھایا جائے کہ ہمیں تمہاری طرف سے خطرہ ہے۔''

بیرام بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کوئی فیصلہ کیا ہو اور آپ کو اس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ چراغ اکیلی آتی جاتی ہے، اس کا محافظ بھی ہو جائے گا۔''

یہ آخری بات تھی جو رہ گئی تھی۔

چراغ کا محافظ.....

چھت کا چور.....

☆.....☆.....☆

مہتاب قریب آئی ہی تھی کہ وہ اُٹھ کر چلا گیا۔اماں نے بہو کی طرف دیکھا۔ بے عزتی کے احساس سے اس کا چہرہ سمٹ گیا تھا۔شمس اوپر مچان کی طرف جا چکا تھا۔اماں کتنی گہری سوچ میں تھیں۔ست قدموں سے مہتاب واپس پلٹ گئی۔

''کیا ہوا بھابھی.....''افروز آئیں۔ایک نظر اوپر مچان کی طرف دیکھا۔ مچان تو وہاں سے کیا دکھائی دیتی کھڑکی میں کھڑی چراغ دکھائی دے گئی۔سیب کتر رہی تھی۔آنکھیں چمک رہی تھیں۔ہونٹ البتہ بھنچے ہوئے تھے۔مکار،عیار،چالاک لڑکی۔

''بیرام کی عقل دیکھو افروز.....''

''وہ کہہ رہا ہے امام صاحب نے خاص کہا ہے۔بیرام نے بھائی صاحب کی وجہ سے لحاظ رکھا نہ رکھتا پھر آپ کہتیں۔''

''اسے شکار کی عادت ہے۔چھت کا محافظ ہو گیا اور چوہدری دلاور کی بے عزتی ہو گئی۔''

چچی نے گہرا سانس لیا۔''مردوں میں یہ معاملات چلتے رہتے ہیں۔''

''چپ ہو جاؤ افروز!بالکل خاموش.....''وہ بہت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

''اگر چراغ نے وہ شرارت نہ کی ہوتی تو آپ کبھی ایسے پریشان نہ ہوتیں۔بیرام نے پہلے بھی اس طرف پہرے دار رکھے ہیں،اب کیوں گھبرا رہی ہیں؟''

اماں نے گھبرائے ہوئے،سہمے ہوئے دل کو تسلی دینی چاہی۔انہیں یقین کیوں نہیں آ رہا تھا کہ جو دکھائی دے رہا ہے وہی سچ ہے۔ہاتھ جھلاتی چراغ اماں کے قریب سے گزر کر سامنے تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔مزے سے سیب کھا رہی تھی۔خالہ کا بھجوایا کرتا پاجامہ پہنا تھا۔دوپٹہ یہاں وہاں ہر شے کو سلام پیش کر رہا تھا۔دلی والی پہن کی پازیبیں ابھی تک پہنی تھیں۔پیروں کو جھلا رہی تھی تو ان کا شور ہوتا تھا۔

''چراغ.....''اماں نے اسے سنجیدگی سے متوجہ کیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا.....اگر مجھے کچھ کہا گیا تو میں آپ کی یہ بڑی ساری حویلی چھوڑ دوں گی۔بے شک مجھے کسی جنگل میں جا کر رہنا پڑے.....ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہوں گی،مٹی کے برتنوں میں پکا کر کھاؤں گی لیکن یہاں سے چلی جاؤں گی۔یہ بھی کوئی زندگی ہے،رات دن مجرم ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ہر وقت قاضی بنیں میرے اعمال کا حساب لیتی ہیں۔اب میں ضرور ہی انصاف کی دہائی دوں گی۔اب میں ضرور ہی اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا پردہ فاش کروں گی۔''

اس نے جواب نہیں دیا تقریر کر دی۔اماں جھونپڑی میں رہنے والی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''سارے دکھ بیٹی کو ہی دیں گی۔ سارے الزام اولاد پر ہی لگائیں گی۔ دکھوں سے میرا دل چھلنی ہے، یہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیسے کیسے ظلم ہوتے ہیں مجھ پر۔ چند شرارتیں کیا کر لیتی ہوں ہر وقت آپ کی آنکھ میں کھٹکتی رہتی ہوں۔ چاہتی ہیں ضعیف عورتوں کی طرح رہوں، نہ پہننا اوڑھا کروں، نہ ہوا خوری کے لیے جاؤں۔ کسی کوٹھری میں قید ہو جاؤں۔ میرے سارے کھیل اپنی پھٹکار سے تباہ کر دیتی ہیں۔'' تقریر جاری تھی۔ روہانسی ہو ہو جاتی تھی۔ اماں کے سرہانے کھڑی حور غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا ہے بلکہ کافی بڑا تنکا ہے۔''

چراغ نے بھنا کر حور کو دیکھا۔ ''تنکا ہو یا تلوار اگر مجھ سے پڑتال کی گئی تو میں پہلے شہر بھر میں ہنگامہ کروں گی۔ پھر دریا میں کود کر جان دے دوں گی۔ سب کو میرے مرنے کی وجہ معلوم ہونی چاہیے۔ مجھے زدوکوب کیا گیا۔ قلبی تکلیف پہنچائی گی۔ میرے احساسات کا قتل کیا گیا، میری عزت نفس کو کچلا گیا۔'' وہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بے وجہ بے کار بول رہی تھی۔

اماں مسلسل اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''چراغ.....'' اماں نے آج تک ایسی کامل سنجیدگی سے اسے نہیں پکارا تھا۔

''جی.....'' وہ ڈر گئی لیکن ظاہر نہیں کیا۔ ''یا اللہ خیر'' دل میں کہا۔

''اٹھو فرہاد کو حال احوال کا خط لکھو..... اسی وقت لکھو۔''

اس نے دانت پیسے۔ ''یہ فرہاد کہاں سے آ گیا۔''

''آ جائے گا جلد..... حور اسے کاغذ قلم لا کر دو۔''

''کیا سر پر تلوار رکھ کر لکھوائیں گی۔''

''حور سنا نہیں تم نے.....''

''سن لیا اماں بی۔'' حور دانت نکالتی خط مطلب کاغذ قلم لینے گئی۔

''جب یہ خط لکھ چکے تو افروز تم پڑھنا، کوئی ایسی ویسی بات لکھی ہو تو مجھے بتانا۔''

اماں اتنی سنجیدہ کیوں تھیں۔ افروز نے سر ہلا دیا۔ حور کاغذ قلم لے آئی۔ اماں وہیں بیٹھ کر اسے دیکھتی رہیں۔ آج کل اسے بہت کڑوے گھونٹ بھرنے پڑ رہے تھے۔ سلام دعا لکھی، حال احوال بتایا۔ اس کا بھی حال پوچھنا پڑا۔ خط لکھ کر چچی کی طرف اچھال دیا۔ خود دھم دھم کرتی چلی گئی۔ چچی نے خط پکڑا۔ مشکل سے دو سطریں لکھی تھیں۔ پڑھ کر بھابی کو سنایا۔ کفایت کو آواز دی۔

''یہ خط ارسال کروانا ہے۔''

کفایت نے سر ہلا دیا۔ ''بے چاری چراغ بی بی! کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ جسے کبھی خط نہ لکھنے کا عہد کیا تھا اسے بہ نوک تلوار خط لکھنا پڑا..... ہائے یہ مجبوریاں.....'' اس غریبن کو چراغ کی مجبوریاں بڑی اچھی لگیں۔

خط لکھا..... بہ نوک تلوار خط.....

کفایت نے خط ارسال کروایا۔ فرہاد امانی نے خط پایا۔ خط کھولا اور پورے دل سے قہقہہ لگایا۔ خط پر سیاہی سے خوفناک جن نقش تھا۔ لمبے کان، سرخ آنکھیں، کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ خط پر، ''تمہاری تصویر میرے پاس رہ گئی تھی واپس بھیج رہی ہوں، جب جب نظر پڑتی ہے ڈر جاتی ہوں۔'' لکھا تھا۔

دن سرد تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ درسگاہ کی طرف پیدل چلتا جا رہا تھا۔ جلدی میں تھا۔ خط کو جیب میں رکھ کر لے آیا تھا۔ رہا نہیں گیا تو بڑے ارمانوں سے کھول کر آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا تھا۔ سرخ آنکھوں والے جن نے گھور کر فرنگی فرہاد کو دیکھا۔

''کیا میں اس جیسا ہوں؟'' قریب سے گزرتی لڑکی کے سامنے خط لہرا کر دکھایا۔ بے ساختہ پوچھ لیا۔ لڑکی نے فرہاد جن اور خط والے جن کو ایک نظر دیکھا اور ''ہاں شاید'' کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتی بھاگ گئی۔

گہرے بادلوں میں سے جھانکتا سورج..... سورج کی کرنوں میں اپنی تصویر دیکھتا فرہاد امانی۔

''میں ایک جن ہو سکتا ہوں لیکن تم صرف پری..... میری پری.....''

☆.....☆.....☆

پری نے حال احوال والا خط بروقت بدل دیا تھا۔ ویسے بھی چچی کے کمرے سے کوئی چیز غائب کرنے میں مشکل ہی کیا تھا۔ جو مشکل لگ رہا تھا وہ آسانی سے ہو گیا۔ چور کا گھر میں گھس آنا۔ اسے گھر کا کھانا کھلانا۔ پینے کے لیے پانی بھجوانا۔ کئی دن گزرے یہ احساس بھی جاتا رہا کہ کوئی مچان پر رہتا ہے۔ چھت کی نگرانی کرتا ہے۔ بیرام اسے اپنے ساتھ بھی لے جاتا تھا۔ وہ اکثر مردانے میں رہتا، کام کرواتا رہتا۔ کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ اسے چھوٹے کام کہے نہیں جاتے تھے۔ سنجیدگی سے بات کرتا تو پوری توجہ سے سننا پڑتا۔ خاموشی سے ہدایات سنتا تو ہدایت دینے والے کے دل کو دھڑکا رہتا کہ اتنی ہدایات دینا ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ ایک دن باغ کی طرف کا دروازہ، جو شہر میں شمال کی سمت کھلتا تھا درست کرنے لگا۔ ایک بار اس دروازے سے اندر آیا تھا تبھی دیکھ لیا تھا کہ دروازے کے کھلنے بند ہونے میں نقص ہے۔ کیل دانت میں دبا کر دروازے کا جائزہ لیتا رہا۔ نہ کسی نے کرنے کے لیے کہا تھا نہ ضرورت سمجھی تھی۔ مردانے کا ملازم اوزار پکڑا گیا تھا۔ گاؤں میں ایسے کئی کام سیکھے تھے۔ دروازہ کبھی کبھار استعمال ہوتا اس لیے اندازہ نہیں ہو سکا کہ دھکا لگا کر

کھولنا پڑتا تھا۔ کفایت اپنی طرف سے دروازے کا جائزہ لینے آئی تھی۔ چچی اپنے کمرے کی کھڑکی سے سب دیکھ رہی تھیں۔

''واہ! اب آسانی سے بند ہو رہا ہے ورنہ بڑی مشقت لگتی تھی کھولنے میں۔''

ایک پٹ پر ہاتھ رکھا تھا جبکہ وہ اس طرف سے شہر جاتی ہی نہیں تھی۔ اس نے کفایت کی طرف سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ کیل دانت میں دبا تھا۔ دروازے کا دوسرا پٹ زوردار بند کیا۔ بے چاری کا ہاتھ آ گیا۔ تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

''میں نے کام کی تعریف کی.....'' وہ سمجھی اس نے سزا دی۔

''کام جاری ہے مداخلت کرنے کی عادت ختم کر دینی چاہیے۔'' براہ راست اسے مخاطب نہیں کیا۔

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''میں ہمدردی کرنے آئی تھی۔''

''بغیر اجازت ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ اب بھی اس سے مخاطب نہیں تھا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تم پر کس کی وجہ سے مصیبتیں آئیں، تم مجھے بتا سکتے ہو میں اماں بی کو بتا دوں گی دیکھنا پھر.....''

وہ بغیر اجازت مزید ہمدردی کرنے لگی۔ اس نے کچھ اس زور سے کیل پر ضرب لگائی کہ وہ ڈر کر بدکی۔ اس کی طرف سرد نظروں سے دیکھا۔ وہ غصے میں نہیں تھا۔ اچھی بات تھی۔ پھر اس کا منہ ناک سمیت پھول کیوں رہا تھا۔ آنکھیں تو چڑھ بھی گئی تھیں۔ بری بات تھی نا۔

''وہ چراغ ہی تھی نا جس کی وجہ.....'' کفایت نے سرگوشی میں پوچھا۔ ظاہر ہے کچھ لوگ کبھی باز نہیں آتے۔ بالکل باز نہیں آتے۔ کئی دنوں سے اس کے پیٹ میں ہلچل تھی کہ شمس سے کچھ تو اگلوا لے۔ اس نے دانت سے کیل نکالا جس طرف کفایت کھڑی تھی اس طرف دیوار پر رکھ کر زوردار ضرب لگا دی۔ اس بار وہ زیادہ ڈری۔ ایسا لگا اس کی گردن میں کیل گاڑ دینا چاہتا ہو۔

''نہ بتاؤ.....'' غصہ بھی آیا، ڈر بھی لگا۔ چند قدم جا چکی۔ دل میں تھا کہ شاید روک لے۔

''بتا دیتا ہوں.....''

وہ بڑی خوشی سے پلٹی۔ آج تل اوپر والے ہونٹ کے کنارے پر لگایا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ تل اگر کوئی دل والا دیکھ لے تو دل و جان سمیت دھڑام اس کے قدموں میں آ گرے۔

''تمہارے پاس قینچی ہو گی؟''

وہ حیران ہوئی۔ ''ہاں..... ہے..... اس کا تمہاری قید سے کیا تعلق؟''

''قینچی کو بے کار شے نہ سمجھو اسے استعمال میں لاؤ تھوڑی اپنی زبان کاٹ لو۔'' ایک کیل اور دانت میں دبا لیا۔

وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اتنی دلبر داشتہ ہوئی کہ۔ ''یہ کیا دستور ہے بات کرنے کا۔'' کہہ دیا۔

''بات بے بات کرنے کا دستور ہے؟''

''تمہاری زبان گھس جائے گی جو کام کی باتیں کرلو گے؟''

''رکیے میرا ایک کام کردیجئے.....'' قریب سے گزری ماما کو روکا۔ کفایت دیکھتی رہ گئی۔

''یہ محترمہ مجھ سے کام کے بارے کئی سوال کرتی ہیں کیا ان سے میری خلاصی ہوسکتی ہے۔''

کفایت رو دینے کو ہوگئی۔ ماما فوراً فرض سمجھ کر اندر بتانے لپکی۔ چچی ویسے ہی اسے کھڑکی سے باتیں کرتے دیکھ چکی تھیں۔ وہ بے چاری پورا ایک پہر روتی رہی۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ درد سے سر پھٹنے لگا تھا۔ چراغ شوخی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا باتیں کر رہی تھی تم اس سے؟'' چراغ کو بڑا مزہ آرہا تھا۔

''آپ کی طرح وہ بھی سوزبان سے جھوٹا ہے، خود سے مجھے روکا کہنے لگا میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کس نے قید کروایا تھا۔''

''تم نے میری طرح کیوں کہا..... میرا اس کا کیا مقابلہ.....'' چراغ چڑ گئی۔

''دونوں کے مقابلوں میں ہم غریباں پھنس گئے۔ محمود سے پہلے ایاز کی گردن کٹے گی نا۔ اس سے پہلے بتاتا کہ ماما آگئی اور لگی باتیں بنانے۔ اماں بی سے میری شکایت بھی کردی۔'' حویلی میں اکیلی چراغ ہی جھوٹی نہیں تھی۔

''وہ بہت جھوٹا انسان ہے، دیکھتی نہیں جب بات کرتا ہے آنکھیں اندر کھینچ لیتا ہے یہ جھوٹوں کی نشانی ہوتی ہے۔''

''تم نے اس کی آنکھوں میں کب دیکھا؟'' حور الگ ہی نکتہ لائی۔

''پر وہ تو آنکھیں دکھاتا ہے۔'' کفایت کو اپنا ہی غم تھا۔

''یہ جو تم دونوں اس کی آنکھوں کی بات کر رہی ہو تو یہ داستان میں اماں بی کو سناتی ہوں۔'' حور نے ڈرایا۔

کفایت نے توجہ نہیں دی اپنے سر پر بندھا دوپٹہ کسنے لگی۔ ''مجھے صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس کا ارادہ خطرناک ہے۔ وہ حویلی میں کسی خاص مقصد سے آیا ہے۔'' کن انکھیوں سے چراغ کی طرف دیکھا۔ وہ چراغ کو بھڑکا رہی تھی کہ جا کر اس سے میری بے عزتی کا بدلہ لو۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہاری خاص ملازمہ سے ایسے بات کرے۔

چراغ کو ڈر تو کیا ہوتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے اینٹ کا جواب پتھر مل رہا ہے۔ اماں کا مزاج پھر سے خراب تھا۔ اگر اماں کے بھڑکانے پر آغائی نے اس کی وکٹوریہ چھین لی؟ اسے گھر کے کسی کمرے میں قید کردیا۔ اگر اسے واقعی میں کنوئیں میں

کود جانا پڑا۔ یا جھونپڑی میں رہ کر مٹی کے برتنوں میں کھانا پکانا پڑا۔ یا اللہ کتنی مشکل زندگی ہے۔ دشمنوں میں گھر چکی ہے وہ۔

☆.....☆.....☆

فرہاد کا خط آیا تھا۔ اماں نے کہا پڑھ کر سناؤ۔

''میرے نام خط آیا ہے میں بعد میں آرام سے پڑھوں گی۔'' جیسا خط لکھا تھا یقیناً ویسا ہی کچھ جواب آیا ہوگا۔ کاٹنے والا جانتا ہے اس نے کیا بویا تھا۔

''میں نے کہا پڑھو کیا لکھا ہے۔'' اماں بھی نا۔

''پہلے میں پڑھوں گی پھر آپ کو پڑھ کر سناؤں گی۔'' اس نے شرمانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اتنی مضحکہ خیز تھی کہ چچی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس نے پھر کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اماں نے بھی حیرت سے اس کے شرمانے کو دیکھا۔ اتنے سالوں میں خطاء ہوئی جو وہ کبھی فرہاد کے نام سے شرمائی ہو۔ پھر حیا کی سرخی خود اس سے دُور بھاگتی تھی، اس پر جچتی ہی نہیں تھی۔ اماں نے حور کو اشارہ کیا کہ اس سے خط کھینچ لو اور پڑھو۔ اس سے پہلے کہ حور کھینچتی اس نے فوراً طوطے کی طرح پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔

''سلام چراغ! تمہارا خط آیا پڑھ کر خوشی ہوئی کہ گھر میں سب خیریت سلامت ہے۔ خالہ جان کی طبیعت کی فکر جاتی رہی۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ شاید وہ مجھے یاد کرتی ہوں گی، تمہارے خط سے تصدیق ہوئی کہ خالہ جان مجھے کتنا عزیز رکھتی ہیں۔ خالہ جان کی دعائیں ہی ہیں جو میرا دل مضبوط ہے اور میں اتنی دور اکیلا سنبھل کر رہتا ہوں۔ چچی جان کو خاص سلام۔ ان کے پان یاد آتے ہیں۔ بیرام بھائی کو خط لکھا ہے ان کا جواب بھی تسلسل سے آجاتا ہے۔ سب کو سلام۔'' سنا کر سب پر نظر ڈالی کہ لو ہوگئی تسلی۔

''اتنا مختصر خط..... مجھے تو بہت لمبے لمبے لکھتا ہے۔''

''آپ ہی نے اسے منع کیا ہے کہ مجھ سے بس سیدھی باتیں کرے، سیدھی باتیں مختصر ہی ہوتی ہیں۔'' آنکھیں مٹکائیں۔

''اچھا وہ سطر پھر سے پڑھو کہ خالہ جان کی دعائیں ہی ہیں۔'' اماں کا شک جاتا نہیں تھا۔

اس نے واپس خط کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی سطر ہوتی تو وہ پڑھ کر سناتی۔ جو سنا چکی تھی اسے لفظ آگے پیچھے کیے بغیر کیسے دہرا دیتی۔ وہ گڑبڑا گئی۔ دعا والی سطر ٹھیک سے یاد نہیں آئی۔ ''بار بار خط پڑھنے سے خط کا اثر کم ہو جاتا ہے۔'' کہہ کر اپنے کمرے کی طرف کھسک گئی۔ ارادہ تھا رات کو شمع پر رکھ کر جلا دے گی۔ راکھ کو پانی میں بہا دے گی۔ پر رات کو حور نے بستر

کی چادر کے نیچے سے خط برآمد کرلیا۔ وہ اس خط کی کھوج میں ہی تھی۔ خط کھول کر دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ لمبی جھاڑو پر لمبی ناک والی بڈھی جادوگرنی بیٹھی تھی۔ لمبی ٹوپی، لمبی زبان، لمبی پوشاک، جس کا آخری کنارہ ہوا کے ساتھ پیچھے کی طرف اُڑ رہا تھا۔

''میرے دوست پوچھتے ہیں میری نسبت کیسی ہے، مجھے یہ تصویر چھپانی پڑی اگر وہ دیکھ لیتے تو کتنی شرمندگی ہوتی کہ ایک جادوگرنی سے میری نسبت ہے۔ اب تم ہی اسے سنبھال لو، دیکھو کوئی غلطی سے دیکھ نہ لے۔'' حور نے دانت کو ہونٹ سے کچلا۔ اب وہ سب کے سامنے جادوگرنی کا جادو فاش کرے گی۔ خط ہاتھ میں چھپا کر وہ کمرے سے نکلنے لگی کہ چراغ آ گئی۔ کن اکھیوں سے اس کے ہاتھ میں دبا خط دیکھ لیا تھا۔

''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے.....'' اس جیسوں کی رگ عین وقت پر پھڑکتی ہے۔

''جادوگرنی..... سب کو دکھانے جا رہی ہوں کہ انگلستان سے آئی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... جاؤ دکھاؤ..... میری بلا سے.....''

وہ دروازے سے اندر آنے لگی، حور دروازے سے نکلنے لگی۔ ٹھیک اسی لمحے میں اس نے حور پر حملہ کر دیا۔ دونوں زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ حور خود کو آزاد کروا کر بھاگی۔ سب اپنے کمروں میں سونے کی تیاریوں میں تھے۔ وہ دالان سے بھاگی، اماں بی کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس نے درمیان میں جا لیا۔ دونوں بھاگیں، بھاگیں..... احاطہ، باغ، دالان..... حور آگے، وہ پیچھے..... کفایت نے اپنی کوٹھری سے نکل کر یہ تماشا دیکھا۔ چچی کے کانوں تک بھی ان کی آواز گئی پر وہ ٹال گئیں۔ دونوں میں کچھ نہ کچھ چلتا رہتا تھا۔ حور آدھی سیڑھیاں چڑھ چکی تھی پھر واپس پلٹی۔ اب چھت پر جانا منع تھا۔ بے چاری پھنس گئی، پیچھے چراغ آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ جھپٹ کر اس سے خط گھسیٹنے لگی۔ حور نے دھکا دیا اور اس کا پاؤں لڑکھڑا گیا۔ وہ سیڑھیوں سے گرتی چلی گئی۔

دراصل اس سے پہلے.....

اتنی دھما چوکڑی پر چھت والے نے کنارے سے جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ نیچے تھی اور اوپر والی سیڑھی پر کھڑی حور کو دیکھ رہی تھی۔ نظر حور سے ہو کر اس پر گئی۔ اس نے ایک نظر دیکھ کر سر واپس گھما لیا جیسے کسی خراب چیز کو دیکھ لیا ہو۔ وہ بھنا گئی۔ یہی اس نے اس وقت کیا تھا جب وہ ڈولی سے گرنے لگی تھی۔ وہ کیا سمجھتا ہے..... وہ سمجھتا کیا ہے.....

جو وہ سمجھتا تھا وہی ہوا، حور پر جھپٹنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ وہ جب جب اسے دیکھتا ہے وہ تب تب گرتی ہے۔ کالی نظر، خراب نظر..... وہ زیر لب مسکرایا اور کن اکھیوں سے دیکھنے لگا۔

یہ مسکرانے کا مقام تھا؟

اس کا سر پتھریلی سیڑھیوں سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ یہ اس کا کہنا تھا۔ جبکہ حور کا کہنا تھا کہ ہاں وہ گری ضرور تھی لیکن اتنی بری طرح سے نہیں کہ ایسے بے ہوش ہو جاتی جیسے مر ہی چکی ہو۔ بیرام نے آ کر سخت باتیں کیں۔ سب چپ چاپ سنتے رہے۔ اماں سے بھی خفا ہوا۔ اماں بیرام کو دیکھ کر رہ گئیں کہ آخر ان کا قصور ہی کیا ہے جوان سے سخت کلام کیا جا رہا ہے۔ جاتے جاتے وہ اپنی بیوی کو بھی سختی سے پھٹکار گیا کہ وہ اس کی بہن کا خیال بھی نہیں رکھ سکتی۔ چچی اس کا سر گود میں لے کر بیٹھی تھیں۔ پیشانی سے خون نکلا تھا۔ نکلا تو ذرا سا تھا لیکن اس نے بہانے سے پیشانی مسلتے یہاں وہاں پورے چہرے پر پھیلا لیا تھا۔

''چچی بہت درد ہے، ہائے! ایسا کرتی ہوں مر جاتی ہوں۔'' وہ ایسے کراہ رہی تھی کہ حور دانت پیس رہی تھی۔

مرہم لگایا۔ سر دبایا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں لیے کفایت ٹانگیں دباتی رہی۔ وہی غریبن کی زندگی۔ حور کو بھی یہی کرنا پڑا۔ سب کمرے سے جا چکے کہ وہ سو چکی ہے اسے آرام کرنے دیا جائے۔ آخر میں حور جانے لگی تو.....

''خط کہاں ہے.....'' پیچھے سے آواز آئی۔ بستر پر کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھی مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔

حور بے چاری ڈر گئی۔ دل پر ہاتھ رکھا تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

''خط.....'' وہ خود سے ہی پوچھ رہی تھی کہ خط کہاں گیا۔

وہ دور آخری سیڑھی پر بیٹھا ہے۔ خط اسی کے ہاتھ میں تھا۔ لمبی ناک والی جادوگرنی لمبی جھاڑو پر بیٹھی ہے۔

آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے روشن ہے۔ خط کو چاند کی طرف بلند کیا۔ خط سے چھن کر چاند آنے لگا۔

جادوگرنی اور چاند.....

ایک شمس اور جان کی امان.....

☆.....☆.....☆

جادوگرنی جھاڑو پر سفر کرتی ہے اور بار بار گرتی ہے۔ وہ اپنے بستر سے نکلی۔ نشست سے دوپٹہ اٹھایا اور گلے میں بہا دیا۔ کمرے کی محرابی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ وہ صبح اٹھتے ہی اس میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ کفایت اسے ایک بار جگا گئی تھی۔ اسے کچھ بتا رہی تھی، جو نیند میں اس نے سنا نہیں۔ کھڑکیاں کھلی تھیں، پردے کھنچے ہوئے تھے۔ صبح کی ہوا کتنی پیاری تھی۔ کمرے کی دوسری بڑی کھڑکی احاطے کی طرف تھی، جس طرف ساری حویلی کی صبح و شام چہل پہل رہتی تھی۔ ابھی وہ نیند میں تھی، دوسری کھڑکی میں سے سرسری جھانکا اور نظر بدل لی۔ اور پھر وہ لپک کر اس کھڑکی کی طرف آئی۔ دیوار پر جادوگرنی کی

تصویر بنی تھی۔وہ جھاڑو پر سوار تھی۔ جھاڑو جس پر وکٹوریہ لکھا تھا۔

تیزی سے کمرے سے نکل کر ننگے پیروں اوپر سے بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔ حویلی کی صبح بہت جلدی ہوتی تھی، اس کی صبحوں کا وقت بدلتا رہتا تھا۔ سب دیوار اور جادوگرنی دیکھ چکے تھے۔ اس پر لاحاصل بات بھی ہو چکی تھی۔ لمبی زبان والی اپنی تصویر کے پاس پہنچی۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ طیش سے ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اونچی سی دیوار پر جھاڑو والی کی پرواز بھی بلند تھی۔ چاند کی طرف سفر کر رہی تھی۔ سنگ مرمر کا فرش ٹھنڈا تھا لیکن پیروں کے تلوؤں سے آگ نکل رہی تھی۔

''پسند آئی.....'' حور شرارت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

''تم نے بنائی ہے.....''

''کاش بنا سکتی..... پر یہ ہے کون؟''

وہ گڑبڑا گئی۔ جس کی بھی ہے۔ ''یہ خوفناک شکل وصورت یہاں کس نے بنائی۔'' وہ اتنی شدت سے چلائی کہ اپنی نگرانی میں کام کرواتیں اماں نے اسے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی شہ رگ پر پاؤں رکھا گیا ہے۔

''صبح صبح تمہیں کیا ہو.....'' چل کر اس کے قریب آئیں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا۔

''میری کھڑکی سے ایسا خوفناک منظر دکھائی دے گا تو کیا حال ہوگا میرا۔'' خود کو پرسکون دکھانا چاہا۔

''جب تم غصہ کرتی ہو تو بالکل اس جیسی لگتی ہو، اس کی ناک لمبی ہے تمہاری زبان۔'' ندا نے کہا۔

وہ دنگ ماں کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ حور اٹھلا کر اپنی اماں بی کے شانے پر بازو رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک کہا اماں بی! چراغ اپنا غصہ کم کرو ورنہ یہ آگ تمہیں نگل جائے گی۔''

اس نے ایک لمبا سانس اندر کھینچا۔ ساری حویلی ایک طرف اور وہ دوسری طرف یعنی جادوگرنی کے سامنے کھڑی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ان سب کے کان پر جوں نہیں رینگی تھی۔ اور اس کے ہاتھوں پیروں سے گرم خون کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔

''یہ کس نے بنائی ہے؟'' اس نے حتی المکان تحمل سے پوچھا۔

''پوچھ لیا ہے میں نے سب سے، کسی کو خبر نہیں ہے۔''

''اچھی طرح سے معلوم کریں کس کی حرکت (جرأت) ہے۔''

''ضرورت کیا ہے۔ انہی میں سے کسی بچی کی شرارت ہے۔ اب ایسی بھی کم ظرف نہیں ہوں کہ ایسی بچکانہ شرارت پر عدالت لگا کر بیٹھ جاؤں۔ ویسے سب کے خط بگڑے ہوئے ہیں لیکن دیکھو کتنی پیاری منظر کشی کی ہے۔''

''یہ منظر کشی نہیں چڑیل کشی ہے..... یہ پیاری کہاں سے ہوگئی؟'' وہ ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

''اتنی پیاری کہ چند لمحوں کے لیے دل دہل جائے..... ظالم سی جادوگرنی.....'' اماں نے شرارت سے کہا۔

وہ اپنی ظالم ماں کی بلائیں لیتی..... یہ ماں..... یہ اماں جان..... یہ اس کا کتنا خون جلاتی ہیں۔ وہ سانس درست کرتی تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ پیر جھلانے لگی۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اپنا طیش قابو میں کرنا چاہا۔ کفایت اس سے ناشتے سے متعلق پوچھ رہی تھی۔ چچی نے بھی زخم کی جانچ کی۔ اس کی نظریں بھٹک کر دیوار کی طرف اٹھتی جاتی تھیں۔ اس نے اندر جانا چاہا لیکن قدم واپس جادوگرنی کی طرف اٹھ گئے۔ اماں نے اس کی بے چینی جانچ لی تھی۔ پر وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ اس معمولی سی شرارت پر اتنا بھڑک کیوں رہی ہے۔

''ویسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر واویلا ہوتا رہتا ہے۔ دربار لگتا ہے۔ پیشیاں ہوتی ہیں۔ طوفان ہی آجاتا ہے کہ اس کو حاضر کیا، اس کا ناضر کیا، اب کوئی کچھ نہیں کر رہا۔ یہی کام میں نے کیا ہوتا تو آپ پھانسی کا پھندا تیار کروا لیتیں، ورنہ اس کفایت کے ہاتھوں زہر پلا دیتیں۔ حویلی کی بچیوں کی تربیت پر بہت مان ہے آپ کو، اب یہ کون کر گیا، اس پر کیا.....'' وہ یکدم پھر چلانے لگی۔ سب حیران اسے دیکھ رہے تھے کہ آخر اتنا ہنگامہ کیوں۔ پر وہ انہیں کیسے بتاتی کہ یہ جادوگرنی کی نہیں اس کی اپنی تصویر ہے۔

''چراغ تمہارا کیا لینا دینا ہے اس سے، چھوڑو ابھی صاف کرواتی ہوں۔'' اماں نے پیار سے پوچھا۔

''لینا دینا ہے..... یہ میری حویلی ہے۔ آخر کون ہماری حویلی میں گھس کر ایسی جرأت کرے کہ دیوار پر ایسے (جادوگرانہ) نقش بنا جائے۔ کون ہے وہ۔'' اسے کون ہے کی فکر تھی۔

''ٹھیک کہا۔'' حور معنی خیزی سے مسکرائی۔

''اگر کوئی دیوار تک آ سکتا ہے تو اندر تک بھی آ سکتا ہوگا۔'' اس نے ڈرانے کی کوشش کی۔

''بات کو بڑھانے سے کیا حاصل۔ اچھا جس نے شرارت کی میں نے اسے معاف کیا۔''

''معاف کیا..... مجھے تو کبھی معاف نہیں کرتیں.....'' ہاتھ جھلائے، بازو لہرائے۔

''پھر تم اپنا ذکر لائی..... تمہارا ذکر ہی کیا.....'' اماں بھی بس!

اس کی نظر جادوگرنی کے پیروں پر پڑی اور وہ پوری جان سے اچھل پڑی۔ ''یہ دیکھیں اس نے پازیب پہنی ہے، کسی نے میرا مذاق اُڑایا ہے۔ میری رسوائی کی ہے۔ کیا یہی دستور ہے کہ چراغ کا مذاق اڑایا جائے، اسے کمتر دکھایا جائے۔ کوئی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میری ناک میں دم کیا ہے۔ میری جان (انا) خطرے میں ہے۔'' اس نے رونے کی کوشش کی لیکن اس بار کوئی جھوٹا سچا آنسو نہیں نکلا۔ اماں سمیت سب نے پیروں کی طرف غور کیا۔ وہاں پازیبیں تھیں۔

''پازیب مہتاب بھی پہنتی ہے کفایت بھی..... افروز اپنی نگرانی میں دیوار صاف کروا دو جلدی سے۔'' اماں اس کی خفگی سے ڈر گئیں۔ کہہ وہ ٹھیک رہی تھی کہ کسی نے اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ اب اماں کو بھی برا لگا کہ کوئی ان کی لاڈلی کا ایسے مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ عام معافی نہ دے چکی ہوتیں تو اب عدالت لگا لیتیں۔ چچی نے پانی لانے کے لیے کہا۔ وہ منہ بنا کر کھڑی رہی۔ کوئی اس کی رسوائی پر آواز تک نہیں اٹھا رہا تھا۔ مہری پانی کا برتن لا رہی تھی۔ اس نے لپک کر برتن کھینچا اور دیوار پر دے مارا.....

''مر جائے وہ جس نے یہ تصویر بنائی.....''

وہ سب کو مرنے کی بددعا دیتی ہے۔ وہ سب کو مارنے کی ترکیبیں کرتی تھی۔ واقعی کوئی مر گیا تو؟ اسی کے سامنے مر گیا تو؟ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ کیا کرے، کیسے اسے تلاش کرے جس نے یہ جرأت کی کہ اس کی تصویر، مطلب جادوگرنی کی تصویر دیوار پر بنا دی۔

جادوگر چھت پر ایک اور تصویر بنا رہا ہے۔ وہ آنکھ کی کمان کھینچ رہا ہے..... کمان جو غصے سے تنی ہوئی ہے..... آنکھ جو طیش سے بھری ہوئی ہے۔ بچے ہوئے سیاہ کوئلے سے وہ یہ نقش ایک کاغذ پر بنا رہا ہے۔

''حکیم لقمان کہتے ہیں کہ انسان کے لیے سب سے اچھی دوا محبت یا عزت ہے۔ یہ آنکھیں کس دوا سے ٹھیک ہوں گی۔'' وہ زیر لب خود سے مخاطب تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ آنکھیں کیا..... یہ دل بھی کسی دوا سے ٹھیک نہیں ہوگا.....

کوئی مرہم..... کوئی معالج نہیں ملے گا.....

اس نے فرہاد کو ایک بھڑکتا ہوا خط لکھا، جو ظاہر ہے حور نے عین وقت پر غائب کر کے اپنی ماں کو دے دیا۔ چچی نے اسے پاس بٹھا کر سمجھایا کہ فرہاد سے ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اتنی خفگی دکھانا ٹھیک نہیں۔ محبت میں خفگی سب سہہ

لیتے ہیں بے عزتی کوئی کوئی سہتا ہے۔ تمہیں اس کی عزت کرنی چاہیے۔ ہر دل اتنا کشادہ نہیں ہوتا۔ وہ اتنی دور بیٹھا ہے خط کو چاہت کے لیے کھولتا ہوگا، آگے سے پھٹکار ملے گی تو بے چارہ کیا سوچے گا۔

کیا ان ساری نصیحتوں کا چراغ پر اثر ہوا؟ بالکل نہیں۔

''جادوگرنی تم سے اپنی نسبت ختم کر سکتی ہے۔'' بس ایک سطر بھیج کر اس نے فرہاد کا خون خشک کر دیا۔

''نسبت ختم کر سکتی ہو نکاح نہیں..... میں جلد آ رہا ہوں.....''

اس نے جوابی خط پڑھا اور اترا کر شمع پر رکھ دیا..... جلا دیا..... راکھ کر دیا..... اس کی نیند اُڑا کر وہ مزے سے سوتی رہی۔ کوئی اس سے آگے رہے، اسے نیچا دکھائے وہ ہرگز پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ کسی کو سر پر سوار نہیں کرنا چاہتی تھی کجا دل پر..... یہ دل..... یہ بے ایمان دل..... وہ اس کے سارے قاعدے قانون اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس خوشیوں کے سب سامان موجود تھے، تو وہ ناخوش کیوں ہو؟ اس کی ہر بات مانی جائے، پھر انکار کرنے کا سوال کیوں رہے؟

☆.....☆.....☆

ہر بات سے انکار کرنے والا جادوگر بازار میں کسی کام سے آیا ہے۔

''سلام عزیزم! خط نہیں لکھواؤ گے؟'' محبوب جان کی آواز پر وہ رک گیا۔

''ضرورت نہیں رہی.....'' مسکرا کر بتایا۔

''اس سلام کے جواب کا کیا بنا؟''

''اس کا جواب پہنچا دیا تھا۔''

''تم گئے تھے؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں.....''

''تم مجھے دماغی عارضے میں مبتلا لگتے ہو۔ دیکھو کہ شہر میں یہ بات گردش میں ہے کہ شہر کا پرانا دیوانہ لاپتہ ہے، اس وقت شہر دیوانے سے محروم ہے.....''

''پھر؟''

''سنو عزیزم! ہر شہر میں تین چیزیں نہ ہوں تو شہر ادھورے لگتے ہیں..... امیر تاجر..... ظالم حسینہ..... اور.....''

''اور.....''

''ایک دیوانہ.....''

وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''کچھ نہیں ہوا کرتا اور پھر ایک دن شہر میں ایک نیا دیوانہ پتھر کھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''

''تم بات کو کتنا بڑھا چڑھا کر کرتے ہو۔ مجھے کہیں کوئی دیوانہ دکھائی نہیں دیتا۔''

''ہم نے ان آنکھوں سے کئی دیکھے ہیں۔''

''کہاں گئے وہ؟''

☆.....☆.....☆

سب سو چکے۔ حویلی میں رات کا سناٹا پھیلا ہے۔ نیند سے اس کا بھی برا حال تھا لیکن اسے جاگنا تھا۔ اسے چور کو پکڑنا تھا۔ پازیبیں اس نے نوچ کر پھینک دی تھیں۔ دیوار سے جادوگرنی کی تصویر مٹ چکی تھی۔ رات کی شمعیں روشن تھیں۔ کفایت تک خراٹے لے رہی ہوگی۔ وہ چپکے سے اپنے کمرے سے نکلی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لیکن دل پر غضب کا عالم تھا۔ رات کے اس پہر وہ کس طرف جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے وہ ایک ہی طرف جا سکتی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جس وقت وہ آخری سیڑھی پر آئی، وہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا دکھائی دیا۔ تو وہ اس کے انتظار میں ہی تھا۔ کہ وہ ضرور حساب لینے آئے گی۔ وہ ساری غلط بائیں جان چکا تھا۔

''کون ہو تم.....'' چھت کا محافظ انجان بن کر کھڑا سوال کر رہا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے..... تم کون ہوتے ہو.....''

''بیرام جنگ نے کہا ہے کہ کوئی بے وقت دکھائی دے تو انہیں خبر کروں۔'' کتنا چالاک تھا وہ۔ بیرام کو بتائے گا کہ رات کے اس پہر اس کی لاڈلی چھت پر آئی ہے۔ جب ساری حویلی سو رہی تھی، وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے دانت پر دانت رگڑے۔ یہ خبیث انسان کتنا چالاک ہے۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے دنیا خراب جگہ بنتی جا رہی ہے۔ آخ!

''جاؤ بتاؤ جا کر.....''

اس نے چند لمحے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ پھر وہ اس کے قریب سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک ایک سیڑھی اترنے لگا۔ وہ پیچھے کھڑی حیرت سے گنگ رہ گئی۔ دیکھا دنیا کتنی بری سی جگہ ہے۔ وہ آخری سیڑھی پر پہنچ گیا تو وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری۔ رات کے اس پہر وہ ساری حویلی کو جگا دے گا۔ اب اس میں کیا شبہ رہ گیا تھا کہ جو وہ کہتا تھا وہ کرتا تھا۔ اب اماں دل پر پتھر رکھ کر نہیں بلکہ بڑے دل سے اسے کنوئیں میں پھینک دیں گی۔ ورنہ ایک بڑے سارے برتن میں تیل گرم کروائیں گی اور اسے جھونک دیں گی۔ کفایت آگ میں مزید لکڑیاں جھونکتی جائے گی۔

''وہ تصویر تم نے بنائی تھی.....'' اپنی طرف سے وہ چور کو پکڑنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''کون سی تصویر؟'' چلتا رہا۔

''میری..... مطلب وہ دیوار والی.....''

''دیوار پر جو بنی تھی وہ تم تھیں؟'' بدتہذیب انسان منہ پر سچ پوچھ لیتا تھا۔

''میں جانتی ہوں تم نے بنائی تھی۔''

''جب سب جانتی ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو ایک اور تصویر بنوانی ہے؟''

واللہ.....

''یعنی تم نے ہی بنائی.....''

''ہاں'' اس نے کتنے آرام سے کہہ دیا۔ وہ کتنی جلدی ہاں کہہ دیتا ہے۔

''تم جانتے ہو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔''

''پھر سے سزا کا ذکر، پھر سے خطاء کی بات..... تم سزائیں سنانے کے علاوہ کچھ کر سکتی ہو۔''

''میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔'' غرور سے کہا۔

''جو تصویر اس دیوار پر بنی تھی وہ دوبارہ سے بنا کر دکھا دو۔'' جیب سے کوئلہ نکال کر سامنے کیا۔ وہ کوئلے کو دیکھتی تھی۔ وہ کوئلے والے کو دیکھتی تھی۔ ''کیوں نہیں بنا سکتی؟ کہو تو میں ایک اور بنا دوں.....'' کوئلے کو لہرایا۔ دیکھا کتنا ہی زیادہ منحوس انسان تھا وہ۔

''تم نے ساری حدیں پھلانگیں، ہر نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔''

''اچھا بتاؤ اب کیا سزا دو گی.....؟'' دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

''جب ملے گی دیکھ لینا۔''

''منظور ہے.....''

''تم اور تمہارے منظور ہیں..... دیہاتی.....''

''تم اور تمہاری للکار..... جھوٹی..... اب جاؤ..... جب سزا دینا چاہو تو بلا لینا۔'' اسے نظروں سے دور ہو جانے کے لیے کہا۔

''مجھے میرے ہی گھر سے جانے کا حکم دے رہے ہو؟''

''میں خود چلا جاتا ہوں..... سزا ہی ہے خود جا کر لے آتا ہوں۔''

وہ آگے بڑھ گیا.....

اپنی سزا لینے خود پیش قدمی کرنے لگا۔ باغ کی راہ داری سے ہو کر، کوٹھریوں کے دالان سے گزر کر وہ حویلی کی سمت مڑ گیا۔ دالان میں چلنے لگا۔ آرام و اطمینان سے چل رہا تھا۔ پھر وہ حویلی کے داخلی دروازے سے اندر ہوا۔ یہ دروازہ چراغ ہی کھول کر باہر نکلی تھی۔ اس کے چہرے کے سارے رنگ اڑ گئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ پاگل انسان اسے کسی نئی چال میں پھنسانے والا ہے۔ مسجد گئی تو خط لکھ دیا۔ سلام کا کہا تو حویلی ہی آ گیا۔ اب وہ کیا کرے گا۔۔ وہ بھاگ کر اس کے پیچھے آئی۔

''تم اندر کہاں جا رہے ہو.....؟'' حلق تر کیا۔

''گھر کے کسی بڑے کو جگانے.....'' وہ سنجیدہ تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....''

''جب کہوں گا سن لینا..... مطلب بھی اور مدعا بھی.....'' اس کی بات لوٹا دی۔

لیکن وہ منظور ہے نہیں کہہ سکی۔

شاید اسے حویلی کے کمروں کی سمجھ نہیں تھی۔ وہی جیسے وہ قلعے میں کھو گیا تھا، حویلی میں بھی کھو گیا۔ کتنی بڑی حویلی تھی، کتنی اونچی چھتیں تھیں۔ کتنا رعب تھا اس عمارت کا۔ آخر دولت کا اتنا رعب کیوں ہوتا ہے۔ چیزیں ہی تو ہوتی ہیں، ان سے اتنی حشمت کیوں جھلکتی ہے۔ ہر چیز اپنی قیمت اپنی پیشانی پر چسپاں کیوں رکھتی ہے۔ وہ نشست گاہ سے اندر ہوا۔ وہ اتنا بڑا کمرا تھا جیسے کسی بادشاہ کا دربار ہو۔ دور تک پھیلا ہوا، فانوس ہی فانوس۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ سر اٹھا کر چار اطراف دیکھا۔ پھر سر گھما کر اس کی طرف۔

''تو یہ وجہ ہے تمہارے غرور کی.....''

غرور والی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مستقل ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی رات کے وقت شہد کے چھتے کو چھیڑنے کی۔ مکار انسان کے پاس اس کی ہر چال پر شہ چال ہوتی تھی۔ آخر وہ کیا چاہتا تھا کہ وہ پست ہو جائے۔ یہ دنیا بس مردوں کی بنی ہے، سب چاہتے ہیں کہ لڑکیاں پست ہی رہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتیں پکڑ کر شکایتیں لگائی جائیں تاکہ بے چاریاں پابندیوں میں قید کر دی جائیں۔

وہ دربار نما نشست گاہ کے دوسرے دروازے سے نکلا جو کسی کمرے کی بجائے راہ داری میں نکلتا تھا۔ سامنے ایک لمبی راہ داری تھی۔ طویل..... ''یہ بھی اتنی طویل'' اس نے خود سے کہا۔ ایک دروازہ دکھائی دیا۔ وہ اماں کے کمرے کا دروازہ تھا۔ وہ

اس طرف بڑھ رہا تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے کہ اسے روک لے۔اماں کمرے سے نکل آئیں تو اب اس کے کوئی جھوٹے سچے آنسو کام نہیں کریں گے۔وہ تیزی سے بھاگ کر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

''رک جاؤ.....''(خدا کے لیے)

''پیچھے ہٹو.....''ہٹ دھرمی!

''میں نے کہا واپس جاؤ.....''وہ جھوٹ موٹ رونا چاہتی تھی۔

''اگر تم پیچھے نہیں ہٹیں تو میں چلاؤں گا.....جیسے قلعے میں چلایا تھا۔''

''تو تم بدلہ لے رہے ہو.....''اسے یاد آ گیا کہ وہ اتنا بھڑکا ہوا کیوں ہے۔

''وہ ابھی لینا ہے.....''

''بزدل اور کم ظرف لوگ سختیوں کا واویلا کرتے ہیں۔''استہزائیہ ہنسیں۔

اس نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔''سامنے سے ہٹو.....''

اس کی زبان قابو میں رہنے کی عادی ہوتی تو وہ ایسے مشکل میں نہ پھنستی۔رات کا سناٹا،شمعوں کی روشنی۔نشست گاہ میں دونوں تنہا۔

سارا شہر سو رہا تھا.....وہ دونوں جاگ رہے تھے.....

ساری حویلی محو خواب تھی.....وہ محو کلام تھے.....

شہر میں جس حسینہ کی کمی تھی.....وہ

شہر میں جس دیوانے کی کمی تھی.....وہ بھی.....

''تم چاہتے ہو میں پھر سے تم سے معافی مانگو تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''تم سمجھتی ہو میں تمہاری ہر بھول نظر انداز کر دوں گا،خطاء ہے تمہاری۔''

سناٹا.....

معاف نہ کرنے کا اعلان.....خطاء کا سوال.....

اس نے زندگی میں اتنا بد کلام مرد نہیں دیکھا تھا۔وہ اس کے دانت نہیں،دل و دماغ کھٹے کر رہا تھا۔اس کا دل تھا کہ اسے دیوار میں چنوا کر،اس دیوار کو زمین میں دھنسا دے۔اوپر قید خانہ بنوا دے۔وہاں اس جیسے بد کلام قیدیوں کو رکھا

جائے۔اسے تند نظروں سے گھور کر راستہ چھوڑ دیا۔ دو قدم پیچھے ہوئی۔

''بزدل.....'' راستہ چھوڑ دینے پر طنز کیا۔ نامعلوم سنجیدہ تھا یا شرارت کرتا تھا۔

بزدل نے چند قدم بڑھا کر طاق سے وزنی شمع دان اٹھالیا، وہ اس کے سر پر مارنا چاہتی تھی۔ بعد میں کہہ دیتی کہ اسے گمان ہوا تھا کہ کوئی چوری کرنے آیا ہے، دھوکے میں مار دیا۔

چوراماں کے کمرے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ دستک دینے ہی والا تھا.....

شمع دان اس کے سر کا نشانہ لے چکا تھا.....

''چراغ.....''

ایک غصیلی آواز کی گونج ابھری۔ چراغ کا دل دھک سے رہ گیا۔

رات کی تنہائی، وہ دونوں اور تیسری آواز.....

اس نے کبھی اس آواز کو اتنے غصے میں نہیں سنا تھا۔

☆.....☆.....☆

چراغ چراغ پاء ہے۔۔۔

شمع دان بلند ہے۔۔۔

نشانے پر شمس ہے۔۔۔

اور

پیچھے کس کی چنگھاڑ ہے، یہ سب پڑھنے کے لیے پورا کا پورا ایک مہینہ یعنی تیس دن انتظار کریں۔

Mushak Baam ✓

Mushak e Baam ✗

مشک بام کا مطلب

ایسی خوشبو جو اپنی ذات میں خالص اور بے مثال ہو اسے" **مشک** " کہتے ہیں۔یہ پاکیزہ اور دیر پا ہوتی ہے۔مشک دنیا کی کسی بے جان چیز سے نہیں بلکہ ایک خاص ہرن سے حاصل کی جاتی ہے۔اسی لیے یہ نایاب، خاص اور بے مثال ہے کہ اسے قدرت بناتی ہے۔کچھ اسی لیے محبت کو مشک سے تشبیہ دی جاتی ہے۔اور" **بام** " ایسی بلندی کو کہتے ہیں جو آسمان ہو یعنی جو ہر کسی کی پہنچ میں نہ ہو۔

مشک :ایسی خوشبو جو دیر پا اور بے مثال ہے۔

بام: ایسی بلندی جو آسمان ہے۔

مشک بام:خالص بے مثال مشک جو اپنی ذات میں بلند ترین ہے۔

ناول سے اس کا تعلق: ناول پڑھ لیں،ایک پوائنٹ پر" **مشک بام** " سامنے آجائے گا۔

Sumaira Hameed